Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1964

پاکستان کی حفاظت

و اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ۔ ترھبون بہٖ عدو اللہ و عدوکم ۔ و آخرین من دونھم لا تعلمونھم ۔ اللہ یعلمھم ۔ و ما تنفقون من شئی فی سبیل اللہ یوف الیکم و انتم لا تظلمون (۸ : ۶۰)

تم دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ امکان بھر سامانِ حفاظت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو، تاکہ تم ان کے ذریعے ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کے بھی دشمن ہیں اور دینِ خداوندی کے بھی دشمن۔ اور ان کے علاوہ انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا ابھی تمہیں علم نہیں ہؤا۔ اللہ کو ان کا علم ہے۔ ان انتظامات کے لئے روپے کی بھی ضرورت ہوگی۔ سو تم سمجھ لو کہ تم دین کے قیام اور استحکام کی خاطر جو کچھ بھی خرچ کروگے وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائیگا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائیگی۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے سالانہ — دس روپے
غیر ممالک سے سالانہ — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون نمبر (۸۰۰۸۰)
خط و کتابت کا پتہ
ناظم طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۷ ● مارچ سنہ ۱۹۶۴ء ● نمبر ۳

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات ———— ۲
۲۔ کیا قربانی کا منکر کافر ہے؟ (علامہ غیاض الجقاد معری) ———— ۱۳
مترجمہ سید نصیر شاہ صاحب میانوالی
۳۔ نبی الامیّ (محترم محمد اختر مسلم) ———— ۲۵
۴۔ مجلسِ اقبال ———— ۳۲
۵۔ رابطۂ باہمی ———— ۳۸
۶۔ حقائق و عبر (۱) اختلافات کے فائدے (۲) تلاعب بالدین ———— ۴۱
(۳) بصد چشم نم
۷۔ نقد و نظر (۱) لمعات (عربی) (۲) ماہنامہ میثاق ———— ۴۷
۸۔ قتلِ مرتد (محترم رفیع اللہ خان صاحب) ———— ۴۹
۹۔ باب المراسلات (صحابہ کبارؓ اور احادیث) ———— ۷۳
۱۰۔ بچوں کا صفحہ (ہم عید کیوں مناتے ہیں) ———— ۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

(۱) دارد کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ایک قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ فکر و بصیرت کی روشنی میں اپنی راہیں اور منزل متعین کرنے کے بجائے وہ جذبات کے ہنگاموں میں کھو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہر جدوجہد بگولوں کا رقص بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کا سفر ایسی آوارگی میں بدل جاتا ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ چند خوبصورت الفاظ۔ جذباتی نعرے اور دلفریب اصطلاحیں ہوتی ہیں جن کے محور پر اس کی توانائیاں گردش کرتی ہیں اور بس۔ یہ الفاظ، نعرے اور اصطلاحیں کوئی متعین مفہوم نہیں رکھتے بلکہ اس کے قلب و نگاہ کی پریشانی اور ماندگی کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور وہ اس خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا رہتی ہے کہ اس کا شمار بھی زندہ اور سرگرم عمل قوموں میں ہے۔ یہ حقیقت ہے تو بڑی تلخ اور ناخوشگوار لیکن کہا جائے کہ ہے یہ حقیقت کہ ہم بھی ایک مدت سے اسی نارواصورت حال کا شکار چلے آتے ہیں۔ ہمارے ہاں منبروں سے جس زورِ خطابت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسٹیجوں سے فصاحت و بلاغت کے جو دریا بہائے جاتے ہیں۔ علمی و ادبی مجالس میں جو موشگافیاں دکھائی دیتی ہیں ان کا دیانت داری سے جائزہ لیجئے تو قرآن کریم کی یہ مثال ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ۔ (۱۲/۴۰) چند دلفریب اصطلاحیں اور الفاظ ہیں جو روایتی طور پر دہرائے چلے جاتے ہیں۔ سننے والے انہیں جھوم جھوم کر سنتے ہیں اور سن سن کر جھومتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی متعین مفہوم نہ کہنے والوں کے پیش نظر ہوتا ہے اور نہ سننے والوں کے ذہنوں میں۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں ہم نے بڑے زور و شور سے یہ نعرہ لگایا تھا کہ ــــ "پاکستان کا مطلب کیا ــــ لا الٰہ الا اللہ"۔ اس نعرے سے پورے برصغیر کی فضا گونج رہی لیکن پاکستان کا یہ "لا الٰہ الا اللہ" نہ اس وقت عام ذہنوں میں واضح تھا اور نہ حصول پاکستان کے بعد آج تک اس کا کوئی واضح تصور اور متعین مفہوم کسی کے سامنے آسکا۔ آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ ہماری ملت کا ہر فرد اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ ایک کیمونسٹ کو بخوبی معلوم ہے کہ جب وہ

اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتا ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ جمہوری نظام کا ایک مدعی پوری طرح جانتا ہے کہ اس کے ذہن میں جمہوریت کا ایک متعین تصور موجود ہے۔ لیکن جب اسلام کے بڑے سے بڑے مدعیوں سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ تم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو تو اس سے تمہاری مراد کیا ہوتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک مسلمان کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے تو وہ یوں منہ تکتے رہ جاتے ہیں جیسے کسی دہقان سے افلاطون کا فلسفہ پوچھ لیا ہو۔ اور جو جواب ان کے ہاں سے ملیں گے انہیں دیکھئے تو ہر ایک کا جواب مختلف ہو گا۔ یہ ہے فکر و نظر کا وہ انتشار جس میں پوری قوم کھوئی چلی آ رہی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ صدیوں سے ہم جذبات کے دھاروں میں بہتے چلے آ رہے ہیں۔ سنجیدگی سے حقائق کا سامنا کرنے اور ان کی گہرائیوں کا جائزہ لینے کی ہم میں وہ صلاحیت موجود نہیں جو ہر زندہ قوم کا طرۂ امتیاز قرار پاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ رٹا رٹایا فقرہ ہر مجلس میں سنائی دے گا کہ "اسلام اعتدال کی راہ ہے" نظام زندگی کے بارے میں کوئی اہم سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہو۔ جمہوریت، ڈکٹیٹرشپ، اشتراکیت، سرمایہ داری کسی نظام کے مقابلے میں اسلام کی انفرادیت کا تذکرہ ہو ہم فوراً یہ کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں کہ اسلام کے نظام میں نہ جمہوریت ہے نہ ڈکٹیٹرشپ۔ بلکہ اس کی راہ ہر دو کے بین بین ہے، وہ نہ اشتراکیت ہے اور نہ سرمایہ داری۔ بلکہ ہر دو نظامہائے زندگی کے مابین اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ مغربی جمہوریت، ڈکٹیٹرشپ، اشتراکیت سب واضح نظریات پر مبنی ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ ایک متعین مفہوم رکھتے ہیں۔ اور ان کے داعی اور علمبردار آپ کو اپنے اپنے فلسفۂ زندگی کے ہر پہلو سے تفصیلاً روشناس کرا دیں گے لیکن اسلام اور اس کا وہ نظریۂ حیات کیا ہے جو اعتدال کی راہ ہے۔ یہ کوئی بھی آپ کو نہیں بتائے گا۔ اس رٹے رٹائے فقرہ کا متعین مفہوم اور واضح تصور کسی بارگاہ سے نہیں ملے گا۔

معاشی مسئلہ کو لیجئے۔ پوری دنیا میں اس مسئلہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ یہ مسئلہ ہر جگہ ایک "مستقل ازم" کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس کا حل مختلف نظامہائے زندگی کی صورت میں قرار پا چکا ہے۔ اور اقوام عالم کی سیاسیات ان نظامہائے زندگی کے محور پر گھوم رہی ہیں۔ خود ہمارے ہاں اس مسئلہ نے جو شدت اختیار کر لی ہے اس نے واضح کر دیا ہے کہ جب تک ہم اس کا دو ٹوک حل تلاش نہیں کریں گے ہمارے معاشرے میں الجھنوں اور پریشانیوں کی شدت بڑھتی چلی جائے گی۔ دوسری قوموں نے اپنے اپنے ملک اور معاشرہ کے مخصوص حالات کے مطابق اس کے مختلف حل تلاش کر لئے۔ اشتراکیت، سرمایہ داری اور اسی قسم کے دیگر معاشی نظام ہر ملک کی ضرورتوں کے مطابق ان کے ہاں کام کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں معاملہ ان سے مختلف ہے۔ ہم نے اعلان کر رکھا ہے کہ ہم اپنے معاملات اسلام کی روشنی میں طے کریں گے اور اسی کی روشنی میں ان کا حل تجویز کریں گے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ہماری تمام مشکلات کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب کوئی مسئلہ ابھر کر سامنے آتا ہے تو ہم اسلام کی روشنی میں اس کا کوئی حل طے کرنے میں قطعی طور پر ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

پچھلے سولہ سال کی تاریخ سامنے لایئے۔ کتنے اہم مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ کتنے نازک مرحلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن تاریخ سے پوچھئے کہ ان میں سے کوئی ایک آدھ مسئلہ بھی ایسا تھا جسے ہم نے اسلامی نقطۂ نظر سے حل کرنے میں کوئی کامیابی حاصل کی ہو۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ ہم ابھی یہ تک طے نہیں کر سکے کہ خود اسلام کیا ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس پر سابقہ اشاعتوں میں ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بہت خون کے آنسو بہا چکے ہیں۔ اسمبلیوں کے ارکان اور حکومت کے کارفرماؤں کو اس مسئلہ کی اہمیت پر بار بار توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کسی نے اسے درخور توجہ نہیں سمجھا۔ پچھلے دنوں محترم صدر پاکستان نے مدیرِ "قدام" سے ایک خصوصی انٹرویو کے دوران میں اہم ملکی مسائل پر اظہار خیال فرمایا۔ اس سلسلے میں ملک کے معاشی مسئلہ پر انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کی ایک جھلک اخبارات کی وساطت سے یوں سامنے آئی کہ

> ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے صدر نے ملک کے موجودہ حالات میں نجی سرمایہ کاری کی حمایت کی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں صرف کھوکھلے نعروں کی پیروی کرنے کی بجائے سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں سے علیحدہ ایسے معاشی نظام پر عمل کرنا چاہیئے جس سے ہمارا ملک ترقی کر سکے۔ صدر ایوب نے اسلام کے متوازن راستہ کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے صنعتی شعبہ میں نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ صرف "خواہش نفع" کی تحریک ہی پیداوار بڑھانے کا محرک بن سکتی ہے۔
>
> تاہم صدر نے دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر دولت چند ہاتھوں میں اکٹھی ہو گئی تو اس کے نتائج بہت تباہ کن ہوں گے۔ (کوہستان ۳۰ جنوری ۶۳ء)

محترم صدر مملکت کے اس بیان میں دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کی مخالفت کے ساتھ ساتھ نجی سرمایہ کاری اور خواہش نفع کی تحریک کی حمایت نے پیش نظر مسئلہ میں کافی "الجھاؤ" پیدا کر دیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس الجھاؤ کی اصل وجہ یہ نقطۂ نظر ہے کہ اسلام، سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام کے بین بین ایک متوازن راہ پیش کرتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس متوازن راہ کی متعین طور پر نشان دہی کی جائے۔ یعنی جس طرح سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام اپنی اپنی جگہ ایک متعین مفہوم رکھتے ہیں، اسی طرح اس متوازن راہ کا بھی تو تعین ہونا چاہیئے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ جب تک یہ طے نہیں ہو گا ہماری زندگی کا ہر مسئلہ منجدھار میں پھنسی ہوئی لکڑی کی سی حیثیت لئے رہے گا اور قدم قدم پر الجھاؤ پیدا ہوتے رہیں گے۔

مسائل زندگی میں متعین اسلامی مفہوم اور واضح تصور اختیار نہ کرنے سے جہاں ملک دولت کی اور مشکلات بڑھتی

چلی جاری ہیں وہاں سب سے زیادہ تباہ کن صورت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ مفاد پرست گروہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور جس روش میں انہیں اپنا فائدہ نظر آتا ہے اسے اسلام کا نام دے کر آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اور جو اس کی مخالفت کرے اسے اسلام کا دشمن اور دین کا مخالف کہہ کر نکو بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک اسلام اور اس کے تصورات متعین ہو کر عوام کے سامنے نہیں آتے یہ عناصر حسب ضرورت نت نئے مفہوم ایجاد کر کے اور بر بنائے مصلحت ان میں حسب منشا تغیر و تبدل پیدا کر کے اپنی مفاد پرستیوں میں سرگرم کار رہیں گے۔ ان کی میکیاولی سیاست آئے دن اسلام کے نام پر گرگٹ کی طرح اپنا رنگ اور طور طریقے بدلتی رہے گی۔ مثال کے طور پر اسی معاشی مسئلہ کو لیجئے اور دیکھئے کہ اسلام کے پیش کردہ نظام کا مفہوم متعین نہ ہونے کے باعث اس باب میں ان کی طرف سے کیا کچھ کہا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ

> اسلام نے کسی نوعیت کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء۔ مکانات۔ سواری غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک خاص حد سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیت زمین از مودودی صاحب ص ۵۲)

پہلے یہ کچھ ارشاد ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک نئی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے تو انہی کے زیر اہتمام اور زیر صدارت منعقدہ لیبر کانفرنس میں یہ قرارداد پاس ہوتی ہے کہ

> اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اصل قدر و قیمت سرمایہ کی نہیں انسان کی ہے۔ اس لئے ایک اسلامی مملکت میں ملک کی دولت اور کاروبار کو عام شہریوں کی ترقی اور خدمت کے لئے وقف رہنا چاہیئے۔ رائج الوقت نظام نے اس دنیا کے تمام ذرائع معاش پر ایک محدود گروہ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور سرمایہ کو انسان کا خدا بنا رکھا ہے۔ اس لئے ملک کی تمام دولت اور کاروبار اس مخصوص گروہ کی اجارہ داری بن چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورت حال سراسر ظالمانہ ہے اور ہم اسے ایک ایسے نظام سے بدل دینا چاہتے ہیں جس میں ملک کی دولت اور کاروبار پر اجارہ داری ختم ہو جائے اور عوام کو رزق حاصل کرنے اور دولت کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ اس نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے جماعت

اسلامی وجودہ معاشی نظام میں حسب ذیل تبدیلیاں چاہتی ہے (۱) بڑی بڑی ملکیتوں اور دولت کے ذخیروں کو اسلامی قانون کے مطابق عوام میں پھیلانے کا کام بلا تاخیر شروع کیا جائے۔ (انجام کراچی - ۲۸ر جولائی سنہ ۱۹۵۷ء)

یعنی جب یہ کہا گیا کہ دولت - جائداد اور زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی، تو وہ بھی اسلام کے عین مطابق تھا اور اس کے بعد جب یہ کہا گیا کہ دولت کو چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں محدود نہیں کر دیا جائے گا تو یہ بھی عین مطابق اسلام ہو گیا۔ اب آگے بڑھئے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں انتخابات کا دور قریب آیا اور عوام کے ووٹوں کی ضرورت محسوس ہوئی اس وقت یہ ارشاد ہوا۔

جماعت اسلامی نے ملک میں زمینداریوں کی جانچ پڑتال کی۔ اور اس امر کا جائزہ لیا کہ یہ زمینیں شروع میں کس طرح حاصل کی گئی تھیں انہوں نے اس امر کی بھی تحقیق کی کہ ان میں سے کون کون سی زمینداریاں اسلامی قانون کی رو سے ناجائز ہیں۔ ان کی تحقیق نے بتایا کہ ملک کی بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں سب ناجائز طریقوں سے حاصل کی گئی تھیں اس لئے انہیں بلا معاوضہ ضبط کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کا تھوڑا سا حصہ ان لوگوں کے پاس حصول معاش کے لئے رہنے دینا چاہیئے۔ (پاکستان ٹائمز - ۱۰ر مئی سنہ ۱۹۵۸ء)

اس ایک مثال سے واضح ہو جائے گا کہ اسلام کے نام پر یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یعنی جو کسی کی مصلحت کا تقاضا ہوا اسے اسلام کہہ کر پیش کر دیا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اب تک نہ اسلام کا مفہوم متعین ہو سکا اور نہ اس کا کوئی دو ٹوک فیصلہ ہوا کہ اسلام کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے۔ یہ سب امور جن پر ایک قوم اور ملت کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے، غیر متعین چلے آ رہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مفاد پرست عنصر جب چاہتا ہے اپنی ضرورت کے مطابق اسلام کی ایک نئی تعبیر ایجاد کر لیتا ہے۔ ایسے عناصر تو یہ چاہتے ہی نہیں کہ اسلام یا اس کا کوئی گوشہ بھی واضح ہو کر افراد امت کے سامنے آئے کیونکہ جب تک ذہنی انتشار کی یہ صورت قائم رہے گی، ان کی مفاد پرستی کی دکانیں بھی رہیں گی۔ لیکن وہ حضرات جو نظام مملکت کے ذمہ دار ہیں اور جن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو گا ان کی طرف سے اس باب میں کسی متعین قدم کا نہ اٹھنا ناقابل فہم ہے۔ ہم نے ہمیشہ اس پر زور دیا ہے کہ اسلام اور اس کے مقاصد متعین کرنے میں جرأت اور عزم سے کام لیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو عوام کے ذہنی الجھاؤ بڑھتے چلے جائیں گے اور پاکستان کا اسلامی مملکت بننا تو درکنار یہ ایک عام سیکولر اسٹیٹ کی سی ترقی پذیر صورت بھی اختیار نہ کر سکے گا۔ — ترقی کرنا تو ایک طرف، پاکستان کو وجود میں آئے سترہ برس کے قریب ہو چلے ہیں۔ اس طول طویل عرصہ میں یہی طے نہیں پا سکا کہ یہاں قانون سازی کا اصول کیا ہو گا۔ سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ کہا گیا کہ

(۱) پاکستان میں کوئی قانون، کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہو گا — اور

(۲) جہاں تک پرسنل لاء کا تعلق ہے ہر فرقہ کی کتاب و سنت کی تعبیر اپنی اپنی ہو گی۔

یہ کہتے وقت نہ تو کسی نے یہ سوچا کہ اسلام کی رُو سے خود مختلف فرقوں کا وجود، کتاب وسنّت کے خلاف ہے اور پرسنل لاز اور پبلک لاز کا فرق بھی کتاب وسنّت کے خلاف! اور نہ ہی کسی نے اس پر غور کیا کہ جب پرسنل لاز میں مختلف فرقوں کی کتاب وسنّت کی تعبیر الگ الگ ہے تو پبلک لاز میں ان کی تعبیر کس طرح متفق علیہ ہوگی۔ آئین مرتب کرنے والوں نے سوچا تو صرف اس قدر کہ اس سے مولوی صاحبان خوش ہو جائیں گے اور انہیں اپنے صحیح اور سچے مسلمان ہونے کی سند مل جائے گی جو آئندہ الیکشن میں کام آئے گی۔ وہ تو یوں کہئے کہ بھلا ہو عسکری انقلاب کا جس نے اس آئین ہی کو کالعدم قرار دے دیا۔ ورنہ اگر اس کے ماتحت قانون سازی کا مرحلہ سامنے آتا تو آپ دیکھتے کہ یہاں کیا گل کھلتے۔ اور دنیا کس طرح ہماری سرپھٹول کا تماشہ دیکھتی۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں یہاں تک تو غنیمت ہوا کہ مختلف فرقوں سے متعلق شق حذف کر دی گئی۔ لیکن قانون سازی کے سلسلہ میں یہ کہا گیا کہ یہاں کوئی قانون اسلام کے خلاف نافذ نہیں ہوگا، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب قوم کے سامنے خود اسلام ہی کا کوئی واضح متفق علیہ مفہوم نہ ہو تو اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا اور کون کرے گا کہ فلاں قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس آئین کو نافذ ہوئے بھی ڈیڑھ دو برس کا عرصہ گزر گیا اور اس شق کے تابع کسی قانون مرتب کرنے کی نوبت نہ آئی ورنہ اس شق کے ناممکن العمل ہونے کا راز بھی کھل جاتا۔ اب اسے پھر تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ وہی ۱۹۵۶ء کے آئین کی شق رکھ دی گئی ہے۔ یعنی (۱) کوئی قانون کتاب وسنّت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور (۲) پرسنل لاز کے سلسلے میں ہر فرقہ کی کتاب وسنت کی تعبیر الگ الگ ہوگی۔ اس سلسلہ میں اور تو اور، کسی نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس ترمیم کا عملاً نتیجہ کیا ہوگا۔ پرسنل لاز نکاح طلاق وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں ان امور کے متعلق ہمارے ہاں عائلی قوانین پہلے ہی نافذ ہیں۔ ان قوانین کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یعنی ان میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مختلف فرقوں کی کتاب و سنت کی تعبیر کیا ہے، لہٰذا اب صورت یوں ہوئی کہ

(۱) ملک میں لیلے پرسنل لاز (عائلی قوانین) نافذ ہیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اور

(۲) آئین کی رُو سے ہر فرقہ کو حق حاصل ہے کہ وہ پرسنل لاز کے متعلق، کتاب وسنت کی اپنی اپنی تعبیر کرے۔

سوچئے کہ اس سے کس قدر الجھاؤ پیدا ہوں گے۔

پھر اس سوال پر بھی غور کیجئے جسے ہم شروع ہی سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ اور جس جرم کی پاداش میں ہمیں کافر اور مرتد اور نہ معلوم کیا کیا کہا جا رہا ہے۔ کہ جس طرح اسلام کی کوئی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) نہیں ہو سکی اسی طرح سنت کی تعریف بھی کوئی دو فرقے متفق نہیں ——— نہ ہی وہ اس امر میں متفق ہیں کہ سنّت رسول اللہ ملے گی کہاں سے۔ شیعہ حضرات کے ہاں سنّت رسولؐ کے مجموعے الگ ہیں اور سنّیوں کے ہاں الگ۔ پھر سنیوں میں سنت کے بارے میں اہل حدیث اور حنفیوں کے ہاں سینکڑوں امور میں سخت اختلاف ہیں۔ حنفیوں

میں دیوبندی حضرات اور بریلوی حضرات، سنت کے مسئلہ پر باہمدگر دست و گریبان رہتے ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل (حالیہ صدر، جمعیت اہل حدیث) مودودی صاحب کی سنت کی تعریف کو دین میں تحریف قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کے نقیب، مولانا داؤد غزنوی مرحوم کو (جو اس زمانے میں جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے) منکرین حدیث کے زمرے میں شمار کرتے تھے۔ اندریں حالات، آپ سوچئے کہ جب ملک کے لئے کسی ایک قانون مرتب کرنے کا سوال بھی سامنے آئیگا تو یہاں صورت کیا پیدا ہوگی۔ ہم حیران ہیں کہ جو بات اس قدر صاف، واضح اور بین ہے وہ ملک کے ارباب بست و کشاد کو نظر کیوں نہیں آتی۔ ہم نے اس مسئلہ پر بار بار غور کیا اور ہر بار اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

(i) یا تو ان حضرات نے اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔

(ii) یا ان میں (معاف فرمائیے) اسے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔

(iii) یا یہ دانستہ اسے ایسا ہی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ملک اس الجھاؤ سے نکلنے ہی نہ پائے۔ اور یا

(iv) یہ اسے سمجھتے تو ہیں اور ملک کو اس انتشار سے بچانا بھی چاہتے ہیں لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں کہ اسے صاف صاف ملک کے سامنے پیش کریں۔

بات کچھ بھی ہو۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکے کہ یہ اس ملک کی انتہائی بدقسمتی کی دلیل ہے۔ جس ملک میں ۱۶ برس میں یہ بھی طے نہ ہو سکے کہ ملک میں قانون سازی کا اصول کیا ہوگا اور جس اصول کو اختیار کیا جائے وہ ناممکن العمل ہو، اس ملک سے بڑھ کر بدقسمت ملک اور کون سا ہوگا؟

سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے ماتحت ایک اسلامک لاز کمیشن کا وجود عمل میں لایا گیا تھا جس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ملک کے مروجہ قوانین کو اسلام کے مطابق مرتب کرے۔ عسکری انقلاب کی رُو سے جب وہ آئین کالعدم قرار دے دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی وہ کمیشن بھی ختم ہوگیا۔ سنہ ۱۹۶۲ء کے آئین کی رو سے اس کے بجائے ایک اسلامی مشاورتی کونسل وجود میں آئی ہے لیکن اس سے ہم نے دیکھنے کو بھی خوش کن توقعات وابستہ کی تھیں۔ نہ اب ایسا کرنے کے کوئی امکانات ہیں۔ اس تمام دوران میں اس نے (اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق) مسئلہ سود پر اپنی سفارشات حکومت کے پاس بھیجی ہیں اور بس۔ اس کے بعد، اس کے چیرمین اور ایک ممبر مستعفی ہو چکے ہیں (یہ دونوں حضرات ریٹائرڈ جج تھے) چیرمین کی اسامی کے لئے علاؤ الدین صدیقی صاحب کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ ان کی کن خصوصیات کی بنا پر لیا ہوا ہے۔ اسے ارباب انتخاب ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ہمارے نزدیک مشاورتی کونسل کا وجود بھی ہمارے پیش نظر مقاصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے ہاں قانون سازی کے اصول کا مسئلہ صاف، واضح اور متعین نہیں ہوتا۔ اس وقت تک کوئی ادارہ بھی مفید مطلب خدمات سرانجام نہیں دے سکتا۔ اسلامی قانون کے سلسلے میں محترم صدیقی صاحب کے خیالات کیا ہیں ان کا بیان ذکر کر دینا

غیر محل نہیں ہو گا۔ ۱۴؍ فروری ۱۹۶۴ء کے پاکستان ٹائمز میں ان کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــ بنیادِ خداوندی ـــ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

عدل کا دار و مدار قانون پر ہے اور اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ قانون ہی کو حاصل ہے (اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ) "جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں۔ کافر ہیں۔" ($\frac{5}{44, 45, 47}$) قرآن میں بنیادی اصول اور ضوابط دے گئے ہیں۔ پیغمبرِ اسلام نے ہمیں بتایا کہ ان بنیادی اصولوں کو عمل میں کیسے لایا جائے گا۔ اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کیسے کی جائے گی۔ اس سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ احکامِ خداوندی کی روح کیا ہے، اور انہیں اپنے زمانے کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق کس طرح عمل میں لانا چاہیئے۔ ہمارے فقہاء نے، فقہی راہنمائی کے ان دونوں ماخذوں کا اتباع کیا اور اپنے زمانے کے لئے بہترین ضابطۂ فقہ مرتب کیا اور اس طرح زمانے کی ریگِ رواں پر ہمارے لئے ایسے نقوش قدم چھوڑ گئے جن سے اس راستے کا سراغ بآسانی مل سکتا ہے کہ ہم بھی اپنے مسائل کا حل آپ دریافت کر کے اپنی زندگی کو بلندیوں کی طرف لے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لئے جرأت مندانہ اقدام کی ضرورت ہے۔

ہاں! اس کے لئے جرأت مندانہ اقدام کی ضرورت ہے اور پاکستان اُبھر اُبھر کر دیکھ رہا ہے کہ یہ جرأت کس سعید روح کے حصے میں آتی ہے۔ محترم صدرِ مملکت پاکستان اس سے پہلے متعدد بار اپنی تقاریر میں اعلان کر چکے ہیں کہ اسلام میں قانون سازی کا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کے غیر متبدل ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کئے جائیں۔ قرآن کے اصول و قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات، حسبِ ضرورت بدلتی رہیں گی۔ اگر اس اصول کو آئینی حیثیت دے دی جائے تو نہ صرف پاکستان میں قانون سازی کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے ہم دیگر اسلامی ممالک کے سامنے ایسی درخشندہ مثال پیش کر سکتے ہیں جس کی تقلید میں وہ فخر محسوس کریں گے۔ اور اس سے دنیا بھی دیکھ لے گی کہ جس قرآن نے ایک بار اس جماعت کو جس نے اسے اپنا راہنما تسلیم کیا تھا! قوامِ عالم کی امامت عطا کر دی تھی اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے متبعین کو دنیا کی قیادت عطا کر دے۔

لیکن اگر سرِدست ایسا نہ کیا جا سکے، تو (بر سبیلِ تنزل) ہم تجویز کریں گے کہ

(۱) حکومت، ملک کے مختلف فرقوں کے نامزد کردہ علماء کی ایک مجلس مقرر کرے اور اس سے کہے کہ وہ ایک متعین مدت کے اندر سنتِ رسول اللہ پر مشتمل ایسا مجموعہ مرتب کر دے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو اور جس میں ملت کی معاشرتی، تمدنی، معاشی، سیاسی زندگی

کے متعلق احکام موجود ہوں ——— اور

(iii) موجودہ اسلامی مشاورتی کونسل کی جگہ یا اس کے علاوہ ایک ایسا کمیشن مقرر کیا جائے جو متعین کرے کہ اسلام کیا ہے۔ اس کے اصول و مبادیات کیا ہیں۔ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ ہماری معاشرتی۔ تمدنی۔ معاشی سیاسی زندگی میں کون سی روش اسلام کے مطابق قرار پا سکتی ہے۔ ان امور کے متعلق وہ ایک جامع کتاب (یا کتابوں کا سلسلہ) مرتب کرے جس کی اشاعت مملکت کی طرف سے ہو۔ یہ ضوابط، باشندگانِ مملکت کے لئے ہی نہیں بلکہ خود مملکت اور اس کے اربابِ حل و عقد کے لئے راہ نمائی کا کام دیں۔

ان امور کو ثانوی حیثیت نہ دی جائے۔ ہم نے جب اس مملکت کو اسلام کے لئے حاصل کیا ہے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں اسلامی طرزِ زندگی کا احیاء ہو گا تو ان امور کی حیثیت بنیادی اور اساسی ہونی چاہیئے۔ لہٰذا انہیں اتنی ہی اہمیت دینی چاہیئے جتنی اہمیت (مثلاً) ملک کے دفاع اور قیامِ امن کے مسائل کو دی جاتی ہے۔ اگر یہ ہو جائے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ فتنے بھی کس طرح از خود ختم ہو جاتے ہیں جو اس وقت اسلام کے نام پر لوگوں میں انتشار پھیلانے اور نظمِ مملکت کو درہم برہم کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھیئے! قرآن کی رُو سے باطل جانا ہی اس طرح ہے کہ حق سامنے آجائے۔ آپ حق کو سامنے لانے کی مثبت کوشش کیجئے۔ باطل خود بخود کافور ہو جائے گا۔ جاء الحق و زھق الباطل۔ ان الباطل کان زھوقا ——— اگر آپ چاہیں گے کہ حق کو سامنے لائے بغیر باطل چلا جائے تو وہ کبھی نہیں جائے گا۔ وہ اپنے بھیس بدلے گا۔ راستے دوسرے اختیار کرے گا لیکن جائے گا نہیں۔ آپ صحیح اسلام کو سامنے لائیے، اپنے مفاد کی خاطر غلط اسلام پیش کرنے والے خود خاموش ہو کر رہ جائیں گے۔

---

(۲) ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

ہندوستان میں ضعیف و ناتواں، مظلوم و مقہور مسلمانوں کی قتل و غارت گری کا مسئلہ اب انتہائی شدت تک پہنچ چکا ہے۔ اس سترہ سال کے عرصے میں (اخبارات میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق) کم از کم ۵۳۲ مرتبہ وہاں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ "فرقہ وارانہ فسادات" کی اصطلاح وہاں کے ہندوؤں نے جان بوجھ کر وضع کر رکھی ہے تاکہ دنیا کے سامنے حقیقت نہ آنے پائے ورنہ جسے وہ فرقہ وارانہ فساد کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ دراصل مسلمانوں کے کشت و خون اور ان کے اتلافِ جان و مال اور بربادیٔ عصمت و آبرو کے جگر پاش اور دلخراش مناظر ہوتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کی ان چیرہ دستیوں کو بزور روک نہیں سکتے۔ اور مظلوم مسلمانوں کی کچھ مدد بھی نہیں کر سکتے۔ بین الاقوامی اداروں میں، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے۔ وہاں بے کس و کمزور اور مظلوم کی وہاں بھی داد فریاد نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ان بیچاروں کی جانیں بچانے کے لئے کیا

کیا کیا جائے۔ اس کے متعلق ہم آج بھی وہی کچھ کہیں گے جو کچھ ہم نے ابتدائی فسادات کے زمانے میں کہا تھا۔ یعنی یہ کہ حکومت کی سطح پر بین الاقوامی آئین و ضوابط کے مطابق تبادلۂ آبادی کا انتظام کیا جائے۔ وہاں کے مسلمانوں کو بحفاظت ادھر منتقل کیا جائے اور ان کی تعداد کی نسبت سے ہندوستان کا اتنا رقبہ پاکستان میں شامل کر لیا جائے۔ باقی رہی ان کی غیر منقولہ جائداد، سو اس کا تصفیہ ایک اعلیٰ سطح کے کمیشن کی زیر نگرانی کر لیا جائے۔ اس کے سوا نہ وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کی کوئی اور تدبیر ہو سکتی ہے، نہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات میں خوشگواری پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے کشمیر کا الجھا مسئلہ بھی نہایت جلدی سے حل ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اسی کا نام ہجرت ہے۔ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ جس علاقہ میں اسلامی نظام نافذ ہو چکا ہو یا جہاں اس کے قیام کے امکانات زیادہ روشن ہوں دوسرے علاقوں کے مسلمان وہاں منتقل ہو جائیں۔ پاکستان میں بردست اسلامی نظام قائم نہیں ہوا لیکن چونکہ اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا ہے اس لئے یہاں اس نظام کے قیام کے امکانات یقینی ہیں۔ اگر اس بلند سطح سے نیچے اتر کر بھی دیکھا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو۔ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان میں بہر حال محفوظ رہے گی۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ان سب کا ادھر منتقل ہو جانا انہیں تباہ کن خطرات سے محفوظ کر لے گا۔ دیگر ممالک میں اس قسم کی تبادلۂ آبادی کی مثالیں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے تحریک پاکستان کے مخالف مسلمانوں نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ تقسیم کا مسئلہ بڑی افراتفری میں طے ہوا۔ اگر یہ لوگ یوں مخالفت نہ کرتے تو تمام متعلقہ مسائل سکون و اطمینان کی فضا میں طے پاتے اس صورت میں پاکستان کی شکل کچھ اور ہوتی۔ اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا مسئلہ بھی خوشگواری کے ساتھ حل ہو جاتا۔ اس کے لئے تبادلۂ آبادی اور حصول رقبہ ہی بہترین صورت تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ گزشتہ سترہ برس میں ہوا ہے اور جو کچھ وہاں اب ہو رہا ہے اسے بین الاقوامی سطح پر سامنے لایا جائے۔ اور تبادلۂ آبادی اور رقبہ کی تجویز کو بطور حل پیش کیا جائے۔ اس میں مشکلات ضرور نظر آتی ہیں لیکن جس شدت سے وہاں خونِ مسلم کی ارزانی ہو رہی ہے اس کے مقابلہ میں ان مشکلات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کی حفاظت تو ہمیں اپنی جانیں دے کر بھی کرنی پڑے تو یہ سودا مہنگا نہیں پڑے گا۔ اگر حالات ایسے ہی رہے تو پھر جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ایسا ہی وہ نازک وقت تھا جب قرآن کریم نے مدینہ کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا
وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا۔ (۴/۷۵)

مسلمانوں! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں جنگ کے لئے باہر نہیں نکلتے۔ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں۔ کتنے ہی بچے ہیں جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آکر فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، نجات دلا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو کارساز بنا دے۔ اور کسی کو ہماری مدد کے لئے کھڑا کر دے۔

کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اس سے پہلے ہی ان مظلوموں کو ان وحشی درندوں کے چنگل سے نکال لائیں۔ ان کے لئے (قرآن کے الفاظ میں) خدا کی زمین کو وسیع کر دیں تاکہ وہ اپنے آپ کو حفاظت کے مقام تک پہنچانے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے بعد جو مسلمان اُدھر ہی رہنا چاہیں ان کی کوئی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوگی۔ لیکن جو اِدھر آنے کے لئے بیتاب ہیں انہیں اِدھر منتقل کرنے کا انتظام ہمیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہمارا فریضہ ہے اور اس کے علاوہ اس مشکل کا حل کوئی نہیں۔

گلبرگ پوسٹ آفس اور ہمارا اظہار تشکر

ابھی ابھی ماہ فروری میں محکمہ ڈاک نے عوام سے اپنے رابطہ کو مضبوط تر بنانے کے لئے ایک ہفتہ منایا ہے۔ ادارہ طلوع اسلام کا واسطہ اکثر و بیشتر گلبرگ پوسٹ آفس سے رہتا ہے اور ہم اس موقع پر بڑی مسرت سے اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ مقامی سب پوسٹ ماسٹر صاحب اور ان کے ماتحت عملے نے ادارے کے ساتھ ہمیشہ حسنِ تعاون کا ثبوت دیا ہے جس کی بدولت ہم ان پریشانیوں سے فی الجملہ محفوظ رہتے ہیں جو ہمارے ہاں بعض دیگر شعبوں میں درپیش رہتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمیں ہر ماہ پرچہ نہ ملنے کی کئی شکایات خریداروں کی طرف سے موصول ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ان کی ذمہ داری بیرونی ڈاک خانوں پر عائد ہوتی ہے گلبرگ پوسٹ آفس پر نہیں۔ یہاں سے ایک ایک پرچہ پوری احتیاط سے آگے بھیجا جاتا ہے۔ ہم اس تعاون کے لئے گلبرگ پوسٹ آفس کے عملے کے شکر گذار ہیں۔

(ادارہ)

کیا قربانی کا منکر کافر ہے؟

علامہ عیاض العقاد

مترجمہ:- سید نصیر شاہ صاحب (میانوالی)

"باب المسائل" مصر کے معروف ماہنامہ "الاسلام" کا مستقل عنوان ہے جس میں ایڈیٹر کی طرف سے مختلف سوالات کے جوابات دئے جاتے ہیں۔ اسکے ایک شمارہ میں قربانی کے متعلق مندرجہ ذیل سوال شائع ہوا تھا۔ میں نے جب اس کا جواب پڑھا تو معلوم ہوا کہ مجیب نے نہایت تحقیقی انداز اختیار کیا ہے۔ اس جواب کو قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں" ——— (س-ن-ش)

سوال :- زید قربانی کا منکر ہے بارہا اس نے اپنے منہ سے یہ الفاظ نکالے ہیں کہ ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کر دی جائے تو وہ اس سے سینکڑوں رفاہ عامہ کے کام کر سکتی ہے بلکہ وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ اس طرح امت مسلمہ کو ہر سال لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اگر یہ رقم کسی اچھے مصرف میں لگائی جاتی تو بہتر ہوتا۔ پوچھنے والی بات یہ ہے کہ کیا ایسے اعتقادات رکھنے کے بعد زید مسلمان رہ سکتا ہے۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ موت کے بعد مسلمان اس کا جنازہ پڑھیں اور کیا مسلمان اس کے ساتھ رشتہ ناطہ کر سکتے ہیں؟ براہ کرم جواب مفصل دیجئے۔

سائل :- خثیم بن صفوان البجلی مقیم قاہرہ۔

الجواب :- سب سے پہلے تو آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نہ اپنے آپ کو مفتی کہتا ہوں اور نہ ایسی مسند افتاء میں نے بچھا رکھی ہے کہ تکیہ سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھوں اور لوگوں کے ایمان تولتا رہوں۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا محض علمی و تحقیقی انداز میں کہوں گا اور جہاں تک میری بصیرت میری راہنمائی کرے گی حق گوئی میں پوری بے باکی سے کام لوں گا۔

قربانی اور قرآن حکیم

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ آیا قربانی قرآن حکیم سے ثابت ہے یا نہیں؛ جب آپ اس امر پر غور کر لیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن میں قطعیت کے ساتھ یہ کہیں نہیں آیا کہ مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں بستے ہوں ذی الحج کی فلاں تاریخ کو قربانی کیا کریں۔ عام مفسرین جن آیات سے استدلال کرتے ہیں میں انہیں بھی درج کئے دیتا ہوں۔

۱۔ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (انعام)

کہہ دیجئے کہ میری صلوٰۃ میری "نسک" میری زندگی اور میری موت رب العالمین کے لئے ہے۔

اس آیت میں "نسک" سے قربانی مراد لی جاتی ہے۔

آیئے "نسک" کا فیصلہ ائمہ لغت سے کرائیں۔

علامہ بستانی لکھتے ہیں۔

"اس مادہ کے اصل معانی دھو کر پاک صاف کرنا ہیں۔ اس کے بعد یہ ہر اس امر کے لئے استعمال ہونے لگا جو خدا کی طرف سے واجب قرار پایا ہو اسی لئے مناسک کا لفظ ان طور طریقوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو واجبات خداوندی کی ادائیگی کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ (محیط المحیط۔ ملخصاً)

علامہ محب الدین محمد مرتضیٰ لکھتے ہیں۔

"نسک البخۃ کے معنی ہیں اس نے بنجر زمین کو درست کیا۔ نسلک الی طریقۃ جمیلۃ۔ اس نے اچھا راستہ اختیار کر لیا اسی لئے نسک اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ اکثر آتے جاتے ہوں۔ اسی بنا پر حج کے امور و مراسم کو بھی مناسک کہتے ہیں نُسُكٌ یا نَسِيكَةٌ۔ ذبیحہ یا خون کے معنوں میں بھی آتا ہے" (تاج العروس ملخصاً)

علامہ ابن قتیبہ کہتے ہیں۔

"نسک ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کیا جائے"

(کتاب القرطین)

غرض یہاں سے آپ نے معلوم کر لیا کہ اگرچہ بنیادی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ زندگی کے ہر اس طور طریقے پر استعمال ہوتا ہے جو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جائے تاہم یہ ذبیحہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور ذبیحہ بھی وہی جو حصول تقرب کے لئے ہو۔ آیہ زیر نظر میں اکثر مفسرین نے نسک سے مناسک حج مراد لئے ہیں کیونکہ قرآن ان معانی میں بھی اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ دیکھئے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ۔ (بقرہ) ــــ جب تم مناسکِ حج سے فارغ ہو جاؤ۔

لیکن قرآن ہی میں یہ لفظ ذبیحہ کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (البقرہ)

پس اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحہ ہوں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سورۂ انعام کی مذکورۃ الصدر آیت میں نسک ذبیحہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یا قربانی کے معنوں میں۔

صلوٰۃ کے ساتھ نسک اور حیات و ممات کے الفاظ صراحتاً اس امر پہ دلالت کر رہے ہیں کہ یہاں لفظ اپنے بنیادی معنوں کے بغیر کسی اور معانی میں استعمال کیا جائے تو ان نئے معانی کے لئے کوئی واضح قرینہ ہونا چاہیئے۔ جیسے فدیہ والی آیت میں ہے کہ وہاں اور کچھ مراد ہی نہیں لے سکتے۔ اور نہ اسے بنیادی معنوں پہ محمول سمجھ سکتے ہیں۔

سورۂ حج میں ہے۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ـ (الحج)

ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر اسے چلنا تھا۔

دیکھئے یہاں لفظ صاف طور پر اپنے بنیادی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

باندازِ دگر

اچھا ایک لمحہ کے لئے ہم یہ بھی تسلیم کئے لیتے ہیں کہ سورۂ انعام کی آیت میں نسک سے مراد ذبیحہ ہے لیکن اس بات کی کسی کے پاس کیا دلیل ہے کہ اس سے وہ قربانی مراد ہے جو ہر سال حج کے مہینے میں ساری دنیا کے مسلمان کرتے ہیں۔ اس آیت سے بھی زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوگا کہ مشرکین بتوں کے حضور اپنے جانوروں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ "میں اللہ کے لئے جانور ذبح کرتا ہوں۔"

خیال رکھئے کہ میں اس قربانی پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں جو حاجی حج کے موقع پر دیتے ہیں۔ اور جس قربانی کے جانور کو اللہ تعالیٰ "ھدی" کہتا ہے۔ نمائندگانِ ملتِ اسلامیہ کے عالمگیر اجتماع میں ہدی کی قربانی اس لئے ہے کہ وہاں وہ لوگ ایک دوسرے کی دعوت کریں۔ اور مختلف ممالک کے نمائندوں میں باہم موانست پیدا ہو اور مل بیٹھ کر وہ لوگ اجتماعی مسائل پر سوچیں۔ دینِ اسلام میں ایسے اجتماعات کے مواقع پر ہر امت کو نبی اکرم سے پیشتر بھی یہ حکم تھا۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ـ (الحج)

اور ہم نے ہر امت کے لئے یہ طریقہ مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ لوگ اللہ کے دیئے ہوئے جانوروں پہ اللہ کا نام لیں (اور انہیں ذبح کریں)۔

یہ آیت "ہدی" کے سلسلہ میں سورۂ حج میں وارد ہوئی ہے۔

دوسری دلیل

اب ان لوگوں کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیے جو قربانی کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

۲- فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (کوثر) اپنے رب کے واسطے صلوٰۃ ادا کر اور نحر کر۔

وانحر کے معنی کئے جاتے ہیں "اور قربانی کر" حالانکہ نحر کئی معنوں میں آتا ہے۔ فراء نحوی کہتا ہے۔

"وانحر کے معنی ہیں اپنا سینہ قبلہ رُخ کیجئے۔" (ابن ابی حاتم)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا۔

"جب یہ سورت نازل ہوئی تو میں نے جبریل سے پوچھا یہ نحر کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ ذبح نہیں بلکہ نماز میں پہلی تکبیر، رکوع اور رکوع سے اٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔"

(ابن ابی حاتم - ابن مردویہ)

جعفر کا قول ہے کہ

"نحر کے معنی ہیں تکبیر اولیٰ کے وقت ہاتھ اٹھانا۔" (ابن جریر)

حضرت علیؓ کا ایک اور قول ہے کہ

"نحر کے معنی ہیں بائیں کلائی پر دایاں ہاتھ رکھنا اور پھر انہیں سینے پر رکھ لینا۔"

(دارقطنی و تاریخ بخاری)

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ

"نحر کے معنی ہیں دو سجدوں کے درمیان اتنا بیٹھنا کہ چھاتی نظر آئے۔" (روح المعانی)

ضحاک کا قول ہے کہ

"نحر کے معنی ہیں نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا۔" (ایضاً)

ان تمام اقوال کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نحر کے وہ معنی ہیں جنہیں بنیادی معنی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب اس وقت پیدا ہوئے جب نماز کا تصور پیدا ہوا۔ رہی وہ روایت جو حضرت علیؓ کے واسطہ سے نبی صلعم کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ سو اس کا ضعف ظاہر ہے۔ جبریل اُسی قوتِ عظیمہ کا نام ہے جو انبیاء کے قلوبِ مقدس پر القائے وحی کرتی ہے وہ وحی کے معانی بتانے نہیں آتی۔ اسناد کے لحاظ سے بھی محدثین نے اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔

"ابن کثیر نے اسے منکر قرار دیا ہے۔ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔"

(روح المعانی جزو ۳۰)

اب لغت کی طرف آئیے۔ علامہ محب الدین محمد مرتضیٰ لکھتے ہیں۔

"نحرالصدر، سینے کے اوپر کا حصہ۔ جہاں ہار پہنایا جاتا ہے۔ نحرالبعیر ینحرہ نحراً۔ اس نے اونٹ کے سینے سے متصل اس جگہ پہ نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے۔ (تاج العروس ملخصاً)

اس کے بعد علامہ مذکور نے وہ تمام اقوال نقل کئے ہیں جو میں پہلے لکھ چکا ہوں ان میں دو باتوں کا اضافہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اونٹوں کو ذبح کرنا ۲۔ خواہشات کا قلع قمع کرنا " (ایضاً)

علامہ زمخشری لکھتے ہیں۔

"نحر کے معنی ہیں کامل دستگاہ حاصل کرلینا۔ حاوی ہو جانا۔ نحرت الشیٔ علماً یعنی علم کے ذریعہ اس پر حاوی ہوگیا " (اساس البلاغۃ)

علامہ بستانی لکھتے ہیں۔

"نحر کے معنی ہیں اچھی طرح علم حاصل کرلینا۔ نحرالامور علماً۔ اس نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ النحرد النحریر کے معنی ہیں ماہر، تجربہ کار، کامل دستگاہ رکھنے والا۔ ہر چیز کو سوچ سمجھ کر اپنانے والا اور ڈٹ کر اس پر عمل پیرا ہونے والا۔" (محیط المحیط)

ہمارے زمانے کے مشہور ماہر لغت علامہ سعد الجیلانی لکھتے ہیں۔

"لفظ نحر بنیادی طور پر ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ کسی نظریہ کو کسی علم کو یا کسی عقیدہ کو غور و تدبر کے بعد قبول کرنا اور پھر اس پر مستحکم ہو جانا۔ یا کسی علم پر پوری بصیرت سے حاوی ہو جانا اور پھر مستقل مزاجی کے ساتھ عمل پیرا رہنا۔ تو قرآن حکیم میں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا مفہوم ہوگا۔ پس نظام خداوندی کے قیام کے لئے مستقل مزاجی سے کوشش کر۔ جب تیسری صدی ہجری میں قومی عمل مفلوج ہوئے اور صلوٰۃ کے مفہوم کو صرف ابتدائی ارکان پر منحصر سمجھا گیا تو نحر کے وہ عجیب معانی بھی پیدا کئے گئے کہ اس کے معنی ہیں نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا وغیرہ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجاہد اور اسماعیل بن ابی خالد وغیرہما نے یہ آیت نکال کر نحر کے معنی ہیں قربانی کرنا اور اس قربانی سے گائے۔ بیل۔ بھیڑ۔ بکری۔ وغیرہ ہر چیز کا ذبح کرنا مراد لے لیا گیا۔ حالانکہ پہلے مجازاً یہ لفظ اونٹ کے ذبح کرنے پر بولا جاتا تھا۔ کیونکہ اس میں بھی نحر کا بنیادی مفہوم پیش نظر تھا۔ اونٹ کو کھڑا کر کے اچھی طرح سے اس کا حلق تاک کر نیزہ اس طرح سے مارنا کہ وہ گر جائے بالکل ان معانی کے مشابہ ہے کہ ایک نظریہ کو نصب العین

بنایا جائے پھر اس کے ساتھ شعوری لگن پیدا کی جائے اور پھر اس طرح عمل کیا جائے کہ نصب العین حاصل ہو جائے۔ (مقدمہ لسان القرآن صفحہ ۴۲)

ان تصریحات سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اول تو نحر سے ذبح کرنا مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اور اگر یہ معانی لے بھی لئے جائیں تو پھر بھی صرف یہ ثابت ہو گا کہ "اونٹ ذبح کر" کیونکہ نحر کا لفظ اور کسی جانور کے لئے بولا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ علامہ رازی نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔

چونکہ نماز بدنی عبادات میں سب سے افضل ہے اس لئے اس کے ساتھ قربانی کی قسموں میں سب سے عظیم قربانی کو ذکر کیا گیا۔" (تفسیر کبیر ج ۸)

یعنی امام رازی صاحب فرماتے ہیں کہ قربانی تو تمام جانوروں کی ہو سکتی ہے لیکن نماز کے ساتھ افضل قربانی کا ذکر کیا گیا۔ گویا اونٹ کی قربانی باقی جانوروں کی قربانی سے افضل ہے۔ اس لئے "وانحر" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ ایک طرف تو قربانی کو سنت ابراہیمی کہتے ہیں۔ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے مینڈھا ذبح کیا تھا دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اونٹ کی قربانی مینڈھے کی قربانی سے افضل ہے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ علامہ رازی جیسے معقول انسان کو یہ غیر معقول دلیل اس لئے تراشنا پڑی کہ روایات ان کے ذہن میں گھر کر چکی تھیں اور وہ قرآن کے منہ میں روایات کی زبان رکھ کر باتیں کرانا چاہتے تھے۔ اسی چیز کو تفسیر بالرائے کہنا چاہئے۔

چلئے ہم نے ایک لمحہ کے لئے یہ بھی مان لیا کہ یہاں وانحر کے معنی ہیں "اونٹ، گائے، بکری، بھیڑ ذبح کر"۔ لیکن پھر وہی اعتراض ہے کہ آپ یہ کہاں سے ثابت کریں گے کہ اس سے وہی معروف قربانی مراد ہے جو ہر سال حج کے ایام میں دنیا کے ہر گوشے میں ہر مسلمان کرتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور اعتراض بھی ہے کہ معروف قول کے مطابق یہ سورہ مکی ہے تو کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ مکہ میں نبی صلعم نے قربانی کی تھی اگر نہیں کی تو کیا آپ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرتے رہے؟ (معاذاللہ)

---

[1] لسان القرآن اپنی طرز کی بے مثال لغت ہے۔ ابھی صرف اس کا مقدمہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس لغت میں قرآنی الفاظ کی تحقیق اس طرح کی جائے گی کہ فلاں لفظ جاہلیت میں کن معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ قرآن نے اسے کن معانی میں مختص کر لیا۔ اور صحابہؓ اس سے کیا مفہوم لیتے تھے پھر بعد کے ادوار میں قوم کی ذہنی سطح کے ساتھ ساتھ بتدریج وہ لفظ کن کن معانی میں استعمال ہوتا گیا۔ یہ اگر لغت مکمل ہو گئی تو بلاشبہ قرآن پر بہت بڑا کام ہو گا۔

(عیاض العقاد)

یہی دو آیتیں ہیں جن سے یہ لوگ قربانی کے حکم پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر آپ دیکھ چکے کہ ان حضرات کا استدلال کتنا کمزور ہے؟

احادیث اور قربانی

اب آیئے احادیث کی طرف۔ پہلے ذخیرۂ روایات میں وہ احادیث ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلعم نے قربانی کا حکم دیا۔ ایک نظر ان کو ملاحظہ فرمایئے۔

"نبی صلعم نے عرفات کے میدان میں فرمایا کہ لوگو! گھر والے پر سال میں ایک مرتبہ قربانی ہے اور ایک مرتبہ عتیرہ[1]" (ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی)

اس روایت میں قربانی اور عتیرہ دونوں کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن محدثین کہتے ہیں کہ عتیرہ بالاتفاق منسوخ ہے۔ رہی قربانی تو علامہ ابن حزم کا ارشاد سن لیجئے۔

"اس روایت کی اسناد میں ابو رملہ غامدی واقع ہوا ہے جو تمام ماہرین فن کے نزدیک مجہول الحال اور گمنام قسم کا راوی ہے۔" (المحلیٰ ج ۷)

دوسری روایت جو بڑے طمطراق سے پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے

"جناب ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو صاحب حیثیت ہو اور قربانی نہ کرے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔" (مستدرک حاکم۔ بخاری ج ۲۔ ابن ماجہ)

اس روایت پر بھی علامہ ابن حزم نے قلم اٹھایا ہے فرماتے ہیں۔

"محدثین و محققین نے کہا ہے کہ اس روایت کی تمام اسناد بالآخر عبداللہ بن عیاش بن عباس پر منتہی ہوتی ہیں جو نہایت مجروح اور حد درجہ ناقابل اعتبار تھا۔" (المحلیٰ ج ۷)

قائلین قربانی کی طرف سے اس سلسلہ میں دو اور روایات بھی پیش کی جاتی ہیں ہم انہیں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلعم مدینہ میں دس سال تک رہے اور قربانی کرتے رہے۔" (مسند احمد ج ۲۔ ترمذی)

اس روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ قربانی کب واجب ہوئی تھی؟ اگر وہ حج کے ساتھ واجب ہوئی تو دس سال کا عرصہ کہاں ہوا کیونکہ بالاتفاق ۶ھ کے بعد ہی حج فرض ہوا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ انہی لوگوں کا ایک اصول بیان کر دیتے ہیں جو ان کے استدلال کی

---

[1] قربانی سے تو وہ الحج کا ذبیحہ مراد ہے۔ اور عتیرہ کہتے ہیں دس رجب کے ذبیحہ کو۔ (حیاض العقاد)

عنکبوتیت واضح کر رہا ہے۔ مشکوٰۃ کے مشہور شارح علامہ ابوالحسن عبید اللہ کہتے ہیں۔

"کسی عمل پر نبی صلعم کے دوام اور مواظبت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل حقیقتاً بھی ضروری ہے"

(شرح مشکوٰۃ ج ۲)

اول تو یہ تسلیم کرنا کہ آپؐ نے دس سال تک قربانی کی خلاف حقیقت ہے اور اگر اسے مان بھی لیں تو شارح مشکوٰۃ کے قول کے مطابق یہ کیسے لازم آیا کہ وہ عمل امت کے لئے شرعی طور پر واجب ہے۔

ایک اور روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے وہ بھی دیکھ لیجئے۔

"جس نے ذوالحج کا چاند دیکھ کر قربانی کا ارادہ کیا۔ اُسے چاہیئے کہ ذبح کرنے سے پہلے نہ تو بال ترشوائے نہ ناخن کاٹے" (ابوداؤد۔ نسائی)

اس روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قربانی کی شرائط بالوں کو نہ ترشوانا اور ناخن نہ کاٹنا بتا رہی ہیں کہ جس طرح ان کی پابندی ضروری ہے اسی طرح قربانی بھی ضروری ہے۔ حالانکہ یہ استدلال بڑا ہی خام ہے۔ کیونکہ یہاں قربانی کو ارادے پر موقوف ٹھہرایا گیا ہے۔ رہا اس کی شرائط کی پابندی کا سوال تو وہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص نفلی روزہ کا ارادہ کر کے روزہ رکھ لے تو اب اس پر وہ تمام پابندیاں عائد ہو جائیں گی جو فرضی روزوں پر ہیں۔

غرض یہی کچھ ہیں وہ دلائل جن کی بنا پر قربانی کو ضروری ٹھہرایا جاتا ہے۔ اب یہ دیکھیئے کہ ائمہ نے قربانی کی کیا حیثیت سمجھی ہے۔

قربانی اور فقہاء

علامہ ابن ارشد لکھتے ہیں۔

"امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خوش حال شہری جو حالت سفر میں نہ ہوں ان پر قربانی واجب ہے مسافروں پر نہیں۔ لیکن امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک قربانی واجب نہیں"

(بدایۃ المجتہد ج ۱)

فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے عبارت ہے۔ کہیں کہیں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر امام یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن نہ معلوم اس معاملہ میں کس دلیل کی بنا پر امام اعظمؒ صاحب کے قول کو ترجیح دی گئی ہے ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اسے سنّتِ مؤکدہ قرار دیتے ہیں مگر وہ بھی ایسی کہ کرنے والے کو ثواب ملے گا اور تارک پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

"ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قربانی سنّتِ مؤکدہ ہے کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا اور ترک کرنے

والے پر کوئی گرفت نہیں ۔" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)

قربانی واجب نہیں اجماعِ صحابہؓ

اب ذرا اس امر پر غور کیجئے کہ کیا صحابہؓ بھی قربانی کو واجب سمجھتے تھے اس سلسلے میں سب سے پہلے تو حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کا عمل ملاحظہ فرمایئے۔ امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ

"ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ قربانی نہیں کرتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں انہیں دیکھنے والے قربانی کو ضروری نہ سمجھیں۔" (کتاب الام ج ۲)

حضرت ابومسعودؓ انصاری کے متعلق شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں کہ

"حضرت ابومسعود انصاریؓ نے فرمایا، میرے پاس صبح شام ایک ہزار بکریاں آتی جاتی تھیں اور میں نے اس خوف سے قربانی نہ کی کہ کہیں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔" (المبسوط ج ۱۲)

حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت بلالؓ کے متعلق علامہ ابن رشد نے لکھا ہے۔

"ابنِ عباسؓ بھی اسے واجب خیال نہیں کرتے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت ابن عباسؓ نے دو درہم دے کر گوشت خریدنے کے لئے بھیجا اور کہا کہ جو ملے اسے کہہ دینا کہ یہی ابن عباسؓ کی قربانی ہے۔ اور بلالؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے مرغ ذبح کیا۔"

(بدایۃ المجتہد ج ۱)

اس روایت سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ اس وقت قربانی کا رواج اس قدر کم تھا کہ قربانی کے روز گوشت فروخت ہو رہا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے تعامل کے متعلق امام ابنِ حزم نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ

"حضرت حذیفہؓ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ قربانی کو اس خیال سے مکروہ جانتے تھے کہ کہیں لوگ اس کی اقتدا ضروری نہ سمجھ لیں۔"

(المحلیٰ ج ۷)

امام مذکور نے حضرت ابومسعودؓ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"بلاشبہ مسلمانوں کی سہولت اور یسر کے خیال سے میں قربانی ترک کر دینے کا ارادہ کر چکا ہوں کیونکہ اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسے ضروری سمجھ لیں گے۔" (المحلیٰ ج ۷)

شارح مشکوٰۃ علامہ ابوالحسن عبید اللہ نے امام بیہقیؒ کی صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے کہ

"حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، ابن عباسؓ، بلالؓ اور ابن عمرؓ صرف اسی اندیشہ سے قربانی کو مکروہ

سمجھتے تھے کہ کہیں انہیں دیکھ کر لوگ اسے ضروری نہ سمجھ بیٹھیں۔" (شرح مشکوٰۃ ج ۲)

انہی شواہد کی بنا پر امام ابن حزم لکھتے ہیں۔

"کسی ایک صحابی سے بھی یہ بات ثابت نہیں کہ قربانی واجب ہے۔" (المحلیٰ ج ۷)

ابن حزم کی طرح ابن حجر اور شارح مشکوٰۃ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

"صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی بھی ذبیحۂ عید قرباں کے وجوب کا قائل نہیں تھا۔ (شرح مشکوٰۃ ج ۲)

علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں۔

"جمہور کے نزدیک قربانی واجب نہیں۔ امام نووی نے کہا کہ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ بلالؓ۔ ابومسعود البدریؓ۔ سعید بن المسیب، علقمہ، اسود، عطاء، مالک، احمد، ابو یوسف، اسحٰق، ابوثور، مزنی، ابن المنذر، اور داؤد وغیرہم بھی اسے واجب نہیں سمجھتے۔ بحر میں ہے کہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ بھی اسے واجب نہیں سمجھتے تھے۔" (نیل الاوطار ج ۵)

علامہ ابوالحسن عبید اللہ نے اس فہرست میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے۔

امام شافعیؒ، امام بخاریؒ اور امام ابراہیم بھی اسے واجب نہیں سمجھتے تھے۔" (شرح مشکوٰۃ ج ۲)

امام ابن حزم نے اس فہرست میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے۔

"سعید بن جبیر۔ حسن بصری۔ طاؤس۔ ابوالشعثاء، جابر بن زید، محمد بن علی بن الحسین سفیان بن عُیینہ۔ عبداللہ بن الحسن اور ابوسلیمان وغیرہم نے بھی قربانی کو واجب نہیں سمجھا۔" (المحلیٰ ج ۷)

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

"قربانی کو واجب بتا کر حنفیہ نے جمہور علماء کی مخالفت کی ہے۔" (ایضاً)۔

انہی شواہد ولطائف کی بنا پر امام موصوف نے فیصلہ دیا ہے کہ

"جو شخص نیک نیتی سے قربانی نہیں کرنا چاہتا اس پر نہ کوئی عتاب ہے نہ شرعی قباحت۔" (ایضاً)

قربانی کے متعلق بعض دیگر روایات

اب قربانی کے متعلق اور روایات بھی سن لیجئے جو اس کے وجوب کو ختم کرتی ہیں۔

"ابو رافع سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے عید الاضحیٰ کے روز ایک مینڈھا ذبح کیا اور فرمایا "میرے خدا یہ میری ساری امت کی طرف سے ہے۔ جس نے توحید و رسالت کی گواہی دی۔" پھر دوسرے مینڈھے کو ذبح کیا اور فرمایا۔ "میرے اللہ یہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی طرف سے ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد بنو ہاشم میں سے

کسی کو قربانی کرتے نہیں دیکھا " (مسند احمد)

حضرت ابن عباس سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلعم نے فرمایا۔

" مجھے چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا۔ مجھے قربانی کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا " (مسند احمد)

یہی روایت ان الفاظ میں بھی بیان ہوئی۔

" تین چیزیں میرے لئے فرائض کا درجہ رکھتی ہیں اور تمہارے لئے نوافل کا۔ قربانی، وتر اور چاشت کی نماز " (بزار، ابن عدی، حاکم)

ایک اور جگہ ہے۔

" مجھ پر قربانی فرض ہے اور تم پر نہیں۔ مجھے چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا "

(مسند ابو یعلیٰ)

خلاصۂ مباحث

اب دوبارہ طے کردہ منازل پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱۔ قرآن حکیم میں کہیں بھی قربانی کا حکم نہیں دیا گیا۔

۲۔ کوئی صحیح حدیث قربانی کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی بلکہ ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کو رسول اکرم صلعم نے اپنے لئے مختص کر لیا تھا۔

۳۔ صحابہ کرامؓ اسے واجب نہیں سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ خصوصیت سے قربانی نہیں کرتے تھے پس اگر وہ روایات صحیح ہوتیں جن میں قربانی کو ضروری قرار دیا گیا ہے تو یہ حضرات کبھی ایسا نہ کرتے۔

۴۔ جمہور ائمہ اسے ضروری خیال نہیں کرتے۔

۵۔ صرف امام اعظمؒ ابو حنیفہؒ اسے واجب سمجھتے ہیں۔

کفر و ایمان کا فیصلہ آپ پر ہے

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا قربانی (جس کا حکم کہیں بھی صراحت سے نہیں) کا منکر کافر ہے یا مسلمان؟ اگر اس معاملہ میں آپ امام اعظمؒ ہی کو برسرِ حق قرار دیں تب بھی آپ قربانی کے منکر کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ حنفیہ کے نزدیک واجب کی تعریف یہ ہے۔

" واجب وہ ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ وہ عملاً لازم ہے اعتقاداً نہیں۔ چنانچہ اس کا منکر کافر نہیں کیونکہ ظنی دلیل سے ثابت شدہ حکم کی بنا پر کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا " (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)

قربانی یا نقد قیمت

اب رہا یہ سوال کہ زید کہتا ہے۔

"ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کردی جائے تو سینکڑوں رفاہ عامہ کے کام ہو سکتے ہیں"

تو میرے بھائی اس بات سے کسے انکار ہے۔ دینِ اسلام کے تمام احکام معقول مصالح پر مبنی ہیں۔ اگر ہر سال اتنے جانوروں کا ضیاع بھی کوئی منفعت بخش فعل ہے تو آپ منہ پر مہر لگائے کیوں بیٹھے ہیں ذرا وہ مصلحت تو بتا دیجئے۔ اگر آپ غلط عقائد کی پیدا کردہ جذباتیت سے بلند ہو کر سوچیں تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر حکومتِ عادل کو یہ رقم اکٹھی کر کے دی جائے تو حکومت بڑے مفید کام کر سکتی ہے اور صرف آپ ہی نہیں۔ ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ بلکہ حضرت بلالؓ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ سنئے امام ابن حزم کیا کہتے ہیں۔

"سوید بن غفلہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے فرمایا "میں اگر قربانی کرتا تو مجھے کوئی خوف نہ ہوتا اگر بکرے کی بجائے مرغا ذبح کر دوں۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے کہ ذبیحہ کے نقد پیسے مسکین کو دے دوں جو انتہائی ضرورت مند اور محتاج ہو۔ میرے نزدیک جانور ذبح کرنے سے یہ فعل افضل ہے"

(المحلی ج ۷)

صاحب ہدایہ قربانی کرنے کو قیمت خیرات کرنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قیمت خیرات کرنے سے قربانی ادا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ

"قربانی کے دنوں میں قربانی کرنا جانور کی قیمت خیرات کر دینے سے افضل ہے"

(ہدایہ ج ۴)

میں نے اپنی طرف سے جو حق سمجھا اسے واضح کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میزان پبلیکیشنز کی شائع کردہ کتابیں

ادارۂ طلوع اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ لاہور

سے براہ راست بھی مل سکتی ہیں۔

نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم

(محترم محمد اختر مسلم صاحب۔ کراچی)

مسلمانوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے جو فروعی و اختلافی مسائل منسوب کر رکھے ہیں۔ ان کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو۔ مثلاً آپ کا وجود خاکی تھا یا نوری۔ آپ کو غیب کا علم تھا یا نہیں۔ آپ کا سایہ تھا یا نہیں۔ آپ کو معراج جسمانی ہوئی یا روحانی وغیرہ وغیرہ۔ انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کیا آپ نوشت و خواند سے واقف تھے یا نہیں۔ اول الذکر مسائل پر امت کے فرقوں میں اختلاف ہے لیکن بدقسمتی سے اتفاق ہے تو اس پر کہ "آپ نوشت و خواند سے ناواقف تھے۔" اس خیال (جو اب ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے) کی تائید میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں بڑی طویل بحث کی ہے۔ اسی جلد میں "اُمیت۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری تعلیم و نوشت و خواند کے داغ سے پاک ہونا" رسول النبی الامی ؐ کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔

قرآن نے آپ کو بار بار اور برملا اُمّی کہا ہے۔ اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہیئے۔

قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی القاب سے مخاطب کیا گیا ہے۔ انہی میں سے ایک "اُمّی" ہے۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن نے آپ کو یہ خطاب کس معنی میں عطا کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چند شرائط ضروری ہیں۔ سب سے پہلی شرط جو خود قرآن کی مقرر کردہ ہے۔ یہ ہے کہ لا یمسہ الا المطہرون۔ قلب و ذہن کی طہارت۔ یعنی قرآن کے مطالعہ کے وقت کسی مسئلہ کے متعلق پہلے ہی سے ذہن میں کوئی تصور نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ مطالعہ کی غرض و غایت صرف یہ ہو کہ اس مسئلہ کے متعلق قرآن کا حکم کیا ہے؟ لیکن جو لوگ کسی مسئلہ کے متعلق خود ہی کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں اور پھر قرآن سے اس کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ قرآن انہیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس سلسلہ میں دوسری شرط یہ ہے کہ قرآن کو قرآن سے سمجھا جائے۔ قرآن کا ایک انداز یہ ہے کہ اس میں اگر کسی مقام پر کوئی بات کہی گئی ہے تو دوسرے مقام پر اس کی وضاحت اس انداز سے کر دی گئی ہے کہ پہلے مقام کی بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اپنے اس انداز کو قرآن نے تصریف الآیات سے

تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور مطالب کی وضاحت کرنا۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہے۔

"اور اس طرح ہم آیات کو لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ لوگ کہیں کہ تو نے بات ذہن نشین کرا دی۔ اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لئے واضح کر دیں جو علم و بصیرت سے کام لیں۔" (قرآن)

امام شیخ محمد عبدہؒ تفسیر المنار کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"قرآن پر غور کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لیں جو زمانہ نزول قرآن میں لئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہتر طریق یہ ہے کہ الفاظ کے معنی کے تعیین میں خود قرآن سے مدد لے۔ اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کرے۔" (مقدمہ تفسیر المنار)

امام رازیؒ لکھتے ہیں "میں نے علم کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں پر غور کیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ مشکلات راہ کے لئے کچھ سود مند نہیں۔ سب سے بہتر طریقہ قرآن ہی کا طریقہ ہے۔"

اسی سلسلہ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ رقمطراز ہیں۔

"قرآن حکیم کے مطالعہ و تدبر میں آپ کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں وہ اس وقت تک پیش آتی رہیں گی جب تک کہ اس بارے میں چند بنیادی اصول واضح نہ ہو جائیں گے۔ یہ موقع تفصیل و اطناب کا نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ صدر اول کے بعد سے قرآن حکیم کے فہم و تدبر کی راہیں دو ہو گئیں۔ ایک قرآنی ہے دوسری غیر قرآنی۔ قرآن کے فہم و تدبر کے لئے غیر قرآنی طریقہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس پر آپ کو تعجب ہو اس میں شک نہیں کہ یہ معاملہ فکر انسانی کے عجائب تصرفات میں سے ہے مگر ایسے تصرفات اس کثرت سے ہو چکے ہیں کہ انہیں عجیب سمجھتے ہوئے بھی ہمیں متعجب نہ ہونا چاہیئے۔ قرآنی طریقہ سے مقصود قرآن کے مطالعہ و فہم کا وہ طریق ہے جو تمام تر قرآن پر مبنی تھا۔ قرآن سے باہر کے اثرات کو اس میں دخل نہ تھا۔ عربی لغت کے صاف اور معروف معنے۔ عربی بول چال کے صاف اور سادہ محاورات۔ صدر اول کے لوگوں کے ذوق و فہم اور انبیائے کرام کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان اس طریقہ کی خصوصیات تھیں۔ سلف امت کا طریق تفسیر یہی تھا۔ غیر قرآنی طریقے سے مقصود وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین کے ذوق و فکر سے پیدا ہوئے۔"

(مکاتیبِ ابوالکلام صفحہ ۵۱ تا صفحہ ۵۳)

بہر حال جب تک قرآن حکیم کی تفسیر خالص قرآنی طریقہ پر نہیں کی جائے گی مشکلاتِ راہ حل نہیں ہو سکیں گی" (صفحہ ۵۲)

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف اور کئی القاب عطا ہوئے۔ انہی میں سے ایک امّی بھی ہے۔ جو سورۂ اعراف کے انیسویں اور بیسویں رکوع میں دو مرتبہ آیا ہے۔

۱۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ۔ (سورہ اعراف) وہ لوگ جو نبی امی کی پیروی کرتے ہیں۔

۲۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ (سورہ اعراف) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے نبی امی پر۔

لفظ امّی کا ترجمہ عام طور پر ان پڑھ کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ کسی بھی مقام پر ان پڑھ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔

۱۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ ۔ اِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (سورہ جمعہ)

اُمیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اسی مفہوم کو قرآن نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے۔

۲۔ بعث فیھم رسولا من انفسھم ۔ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ——— (آل عمران)

اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا اس سے پہلے یہ گمراہ تھے۔ سورہ جمعہ کی آیت کو دیکھئے۔ اس میں مخاطب اہل مکہ ہیں۔ اگر آپ امیین کا ترجمہ "ان پڑھ" کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (آپ کے خیال کے مطابق) اہل مکہ ان پڑھ تھے۔ لیکن اہل مکہ کو ان پڑھ سمجھنا تاریخی حقائق سے انکار ہے۔ اہل مکہ کے پڑھا لکھا ہونے کے ثبوت میں بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جلد کی تنگ دامنی کا احساس آڑے آرہا ہے۔ اس لئے اختصار کے طور پر یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اہل مکہ نے "سبعہ معلقہ" لکھ کر اس چیلنج کے ساتھ کہ اگر دنیا میں کسی کو اپنے علم پر ناز ہے تو وہ اس کا جواب شنے، خانۂ کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کیا۔ ان کے اس چیلنج کا جواب سوائے خدا کے اور کوئی نہ دے سکا۔ انہی اہل مکہ نے جب قرآن حکیم کے کلام ربانی ہونے کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کیا تو اللہ العزت نے انہیں چیلنج کے طور پر لکھا کہ ان سے کہو کہ اگر یہ اسے انسانی کلام سمجھتے ہیں تو اس جیسی کتاب بنا لائیں۔ اگر یہ نہیں تو ایک سورت اور۔ اگر یہ بھی ناممکن ہے تو کم از کم ایک ہی آیت اس کی مثل بنا لائیں۔ اس چیلنج کا آپ تجزیہ کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ چیلنج ہی اہل مکہ کے پڑھا لکھا ہونے کا ثبوت ہے۔ کیونکہ کسی کتاب کا جواب لکھنے یا اس جیسی کتاب لکھنے کے لئے ان پڑھوں سے نہیں کہا جائے گا۔ اور نہ ہی ایسی بات کو عقل سلیم تسلیم کرے گی کہ علم کا جواب کسی جاہل سے مانگا جائے گا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ انہی آیات میں اہل مکہ کو نزول قرآن سے پہلے گمراہ کہا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ان پڑھ تھے۔ ایسا نہیں کہ نزول قرآن سے پہلے وہ ان پڑھ تھے اور نزول قرآن کے بعد پڑھے لکھے بن گئے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیں گے کہ "کاتبین وحی" میں اکثریت اہل مکہ کی تھی۔ صلح حدیبیہ کے وقت اہل مکہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ کا تحریری صورت میں منضبط ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ پھر غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والوں میں سے جو لوگ فدیہ ادا نہ کر سکے تھے آپ کا ان کو اہل مدینہ کے بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھلانے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان پڑھ نہیں تھے۔ کیا اب بھی اس شبہ کی گنجائش ہے کہ وہ ان پڑھ تھے۔

"امی" کا مادہ "ام م" ہے۔ پطرس بستانی اپنی مشہور تصنیف محیط المحیط میں لکھتے ہیں کہ "ام" ایک لفظ جامد ہے اور بچہ کی اس آواز سے ماخوذ ہے جب وہ بولنا سیکھنے سے پہلے ام۔ ام وغیرہ شروع کرتا ہے۔ اس سے اس کے اولین معنے والدہ (ماں) کے ہو گئے۔ ماں کی آغوش کے اعتبار سے انسان کے مسکن کو ام کہتے ہیں۔ قوم اور جماعت کو بھی "امۃ" کہتے ہیں، بالخصوص ہم مسلک و ہم مشرب گروہ بھی امت کہلاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں مختلف انبیاء کے تذکرہ کے بعد ہے۔ اُمۃ قد خلت (۲/۱۳۴)۔ یہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔ دوسری جگہ انہی کے متعلق ہے۔ اِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (۲۱/۹۲) یقیناً یہ تمہاری امت، امتِ واحدہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی ہر شے کی اصل و بنیاد کے بھی ہیں۔ دراصل ام کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی مرکزیت و جامعیت رکھتی ہوں۔ مثلاً ام القوم۔ قوم کا رئیس۔ ام النجوم، کہکشاں، ام الراس۔ دماغ، ام فوج کے جھنڈے کو بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی فوج کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ عربی کے محاورے الخمر ام الخبائث، البغض ام الامراض۔ الکذب ام الجرائم وغیرہ سے ام کی وضاحت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اپنی آیات محکمات کو ام الکتاب کہا ہے۔ یعنی وہ قانون کی اصل و بنیاد ہیں۔

ہر وہ مرکز جہاں بہت سی چیزیں آکر مل جاتی ہیں اُم کہلاتا ہے۔ اس نسبت سے قرآن نے مکہ کو ام القریٰ کہا ہے۔ کیونکہ وہ عربوں کی عقیدت مندی کا قبلہ ہونے کے ساتھ ساتھ حجاز کی اجتماعی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

مکہ کا مادہ م ک ک ہے۔ عربی میں مکاک اور مکاکۃ ہڈی سے نکلے ہوئے مغز اور گودے کو کہتے ہیں جو کہ ہڈی کے وسط میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینے کے بھی ہیں۔ چونکہ اس (مکہ) سے تمام دنیا کو روحانی غذا ملنی تھی اس نسبت سے اسے مکہ کہا گیا۔ مکہ صرف حجاز ہی کی مرکزی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ آپ اگر دنیا کے نقشے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مکہ ساری دنیا کے لئے مرکز ہے۔ چونکہ یہ شہر دنیا کے شہروں کا مغز معلوم ہوتا ہے اس لئے اسے مکہ کہتے ہیں۔ احادیث میں مکہ کو ناف الارض (زمین کی ناف) کہا گیا ہے۔

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی نعمت سے سرفراز فرمانے کے ضمن میں فرمایا کہ لتنذر ام القریٰ ومن حولھا۔ (شوریٰ و انعام) "تاکہ مکہ والوں اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرا سکو۔" ان معانی کی روشنی میں سورۂ اعراف کی وہ آیات جو ہم نے ابتدا میں پیش کی ہیں مطالعہ کریں تو آپ کو یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی کہ امی کے معنے ان پڑھ نہیں بلکہ امی سے مراد مکہ کا رہنے والا ہیں ــــ

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل از زمانۂ نبوت کے تذکرے میں ارشاد ہے کہ وَمَا کُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِہٖ وَلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ (۲۹/۴۸) تو اس (نزولِ قرآن) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا اور

نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔ جہاں یہ آیت قبل از نبوت، نوشت وخواند سے واقف نہ ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتی ہے کہ آپ بعد از نبوت واقف تھے۔ اگر بعثت نبویؐ کے بعد بھی آپ نوشت وخواند سے ناواقف ہوتے تو قرآن میں من قبلہ (اس سے پہلے) کی تخصیص نہ ہوتی۔ پھر قابل غور بات یہ ہے کہ اس آیت میں نوشت وخواند سے عدم واقفیت کے لئے لفظ "امی" استعمال نہیں ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ "ان پڑھ ہونے" کو صفت کے طور پر بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اگر آپ امی کا ترجمہ ان پڑھ کرتے ہیں تو پھر تھوڑی دیر کے لیے سورۂ اعراف کی انہی آیات کو (جو پہلے نقل کی گئی ہیں) سامنے لائیں اور پھر ترجمہ پڑھیے۔

(۱) جو لوگ ان پڑھ نبی کی پیروی کرتے ہیں۔ (۲) ایمان لاؤ ان پڑھ نبی پر

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ "ان پڑھ نبی پر ایمان لاؤ، اور ان پڑھ نبی کی پیروی کرو" بلکہ کسی ایسی خصوصیت کا ذکر ملتا ہے جس کا تعلق اس دعوت سے ہو۔ اس لئے کہ ان پڑھ ہونے کی صفت ایسی نہیں جس کا مخاطب پر اثر ہو۔ اور نہ ہی اس صفت کا ایمان لانے سے کچھ تعلق ہے۔ ایمان واطاعت کا تعلق نبوت سے ہے نبی کی نوشت وخواند سے واقف ہونے یا نہ ہونے کا ایمان واطاعت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ جس ذات گرامیؐ کی خدا سے یہ دعا ہو کہ "اے میرے رب! تو میرے علم کو زیادہ کر" جس نے اپنی امت سے تاکیداً کہا ہو کہ "علم حاصل کرنا ہر مومن مرد اور عورت پر فرض ہے" جس کا ارشاد یہ ہو کہ "علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے تمہیں چین تک بھی کیوں نہ جانا پڑے" کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ حضورؐ خود ساری عمر ان پڑھ رہے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ میں ہوئی۔ اس خطۂ ارض پر آپ کو نبوت عطا ہوئی اور اس شہر کو ام القریٰ کہا گیا تو اس سے یہی ثابت ہوا کہ وہاں کے رہنے والے کو امی کہا جائے گا۔ جیسے حضرموت کے رہنے والے کو حضرمی کہتے ہیں۔ یہودیوں نے آپ کی مخالفت کی تو ان کی مخالفت کی وجہ آپ کا ان پڑھ ہونا نہیں تھا بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان (یہودیوں) کے علاوہ عیسائیوں کا بھی عقیدہ تھا کہ ایک نبی کی بعثت ہوگی جس کی بشارتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت عیسیٰؑ نے دی تھیں۔ ان دو جلیل القدر انبیاء کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ایک آنے والے نبی کے لئے انتظار کی تڑپ تھی اور ان کے اذہان میں اس کے متعلق تصور یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔ مگر جب آپ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو وہ چراغ پا ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ آنے والے نبی کو فلسطین جیسے مقدس خطہ میں پیدا ہونا چاہیئے۔ عرب جیسے حقیر علاقہ سے نبی کی پیدائش ہو، یہ ناممکن ہے۔ نسلی غرور اور علاقائی تعصب نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اسی عصبیت کے نشہ میں بدمست ہو کر انہوں نے آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہم ایک عربی کے سامنے سر تسلیم خم کریں یہ ناممکن ہے۔

عرب میں یہود ونصاریٰ اہل کتاب کہلاتے تھے۔ اور وہ لوگ جو کوئی آسمانی کتاب رکھنے کے مدعی نہیں تھے

ان کے مقابلہ میں غیر اہل کتاب کہلاتے تھے۔ سورۂ آل عمران میں اہل کتاب کے مقابلہ میں لفظ امیین استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے کہ اہل کتاب اور اُمیوں سے کہو کہ کیا تم بھی خدا کے فرماں بردار بنتے ہو اور اسلام لاتے ہو؟ یہاں اگر امیین کا ترجمہ ان پڑھ کیا جائے تو پھر پوری آیت کا ترجمہ ہوگا کہ اہل کتاب اور ان پڑھوں سے کہو کہ کیا تم بھی خدا کے فرماں بردار بنتے ہو اور اسلام لاتے ہو۔ لیکن یہ تو بالکل مہمل بات ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں بھی امیین بہ معنے ان پڑھ استعمال نہیں ہوا۔ یہاں اہل کتاب کے مقابلہ میں امیین سے مراد غیر اہل کتاب ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔

یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اہل مکہ کو بے دین کہہ کر پکارا۔ چنانچہ اس نظریہ کے سبب ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اہل مکہ کی امانتوں میں خیانت کر لی جائے تو خدا اس پر مواخذہ نہیں کرے گا۔ "اہل دین" (یہود و نصاریٰ) بے دینوں (اہل مکہ) کے ساتھ جو کچھ بھی کریں خدا اسے پسند کرتا ہے۔ یہ ان کی عصبیت و نفرت کی انتہا تھی چنانچہ خدا نے قرآن حکیم میں ان کے اس غلط نظریہ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ومن اھل الکتٰب — فی الامیین سبیل — (۳/۷۵) — اور اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس روپوں کا ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو واپس دے دے۔ اور کوئی اس طرح کا ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں۔ یہ اسلئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اُمیوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہ ہوگا۔

ان روایات میں جہاں یہود کی عصبیت کا اظہار کیا گیا ہے وہیں لفظ امیین کے معنے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اگر آپ امیین کا ترجمہ "ان پڑھ" کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ اہل کتاب پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو بد دیانتی نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ ان پڑھوں کے سلسلے میں ایسا کرنے میں باک نہیں سمجھتے تھے یہ مفہوم بداہتاً غلط ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہاں بھی امیین سے مراد ان پڑھ نہیں بلکہ وہی اہل مکہ ہیں۔

دشمنانِ اسلام میں یہودی و عیسائی دونوں شامل تھے اور انہی میں مکہ کے کفار بھی۔ خدا نے ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں امیین بھی ہیں جو اپنے خیالات کی پیروی کرتے ہیں (سورۂ بقرہ) یہاں بھی امیین کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے یعنی ان سے مراد اہل مکہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو آپ نے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے متفقہ دعا مانگی جس کے الفاظ قرآن میں موجود ہیں ابعث فیھم رسولا منھم (البقرہ اور آل عمران) ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول ہو۔ اسی کو قرآن نے دوسری جگہ یوں بیان کیا ارسلنا فیکم رسولا منکم ہم نے تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا بعث فیھم رسولا منھم کے جواب میں ایک جگہ بعث فیھم رسولا من انفسھم اور پھر دوسری جگہ بعث فی الامیین رسولا منھم آیا ہے۔ اس سے بھی اس امر کی

وضاحت ہو جاتی ہے کہ امیین سے مراد اہل مکہ ہیں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے انہیں میں سے ایک نبی کی بعثت کی آرزد کی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے دعا کی ہو کہ اے اللہ! ان ان پڑھوں میں سے ایک ان پڑھ کو نبی بنانا۔

خدا نے ہر قوم میں رسول بھیجے۔ اور عموماً اس ملک کے صدر مقام، مرکز میں ان کی بعثت ہوئی۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ وما کان ربك مھلك القریٰ ـــــــ فی امها۔ تمہارا پروردگار بستیوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کے صدر میں کسی رسول کو بھیج نہیں دیتا جو ہماری آیتوں کو پڑھ کر لوگوں کو سنا دے۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کی بعثت کے لئے اس علاقہ کے مرکزی خطہ کو منتخب کیا جاتا ہے (جسے لفظ ام نے واضح کر دیا) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ چنانچہ آپ کی پیدائش ایسے علاقہ میں ہوئی جو دنیا کے لئے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے اس نے ام القریٰ نام دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امیین سے مراد اہل مکہ اور امی کے معنی مکہ کا رہنے والا۔ نبی الامی کا مطلب ہوا۔ نبی مکی صلی اللہ علیہ وسلم۔ امیین سے مراد اہل مکہ ہیں جنہیں کسی بھی لحاظ سے ان پڑھ نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا امی کا مطلب ان پڑھ لینا قرآنی لحاظ سے غلط ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے مدعی نہیں تھے کہ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب ہے برعکس یہود اور نصاریٰ کے جو اہل کتاب کہلاتے تھے۔

بزموں سے اپیل

یہ ظاہر ہے کہ طلوع اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر اسی صورت میں پھیل سکتی ہے کہ اس کا لٹریچر زیادہ سے پھیلایا جائے۔ میں طلوع اسلام کی تمام بزموں سے درخواست کروں گا کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ دیں۔ اور تحریک سے متعلق کتابیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگائیں۔

میاں عبد الخالق

آنریری مینجنگ ڈائرکٹر۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ
لاہور

مسلسل

اس سلسلہ کی سابقہ قسط طلوع اسلام بابت ماہ نومبر سنہ ۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ (ادارہ)

مجلسِ اقبالؔ

مثنوی ——— پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

در اسرارِ شریعت

دین کی اصولی حقیقتوں سے بیان کرنے کے بعد، اب علامہ اقبالؒ اس کے عملی نظام کی طرف آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلامی معاشرہ کا نقشہ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ معاشرہ کی بنیاد معیشت (روزی) پر ہے معیشت (رزق یا سامانِ زیست) ہی سے انسان کی طبعی زندگی قائم ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی موجودہ منزل میں انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ زندہ رہے۔ واضح رہے کہ بطیبِ خاطر، نظام خداوندی کے قیام اور بقا کی خاطر عند الضرورت جان دینا اور بات ہے اور سامانِ زیست کے نہ ملنے کی وجہ سے فاقوں سے مرجانا اور بات۔ چونکہ انسان کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ زیست کا مہیا ہونا بنیادی سوال ہے، اس لئے قرآن کریم نے اسلام کے معاشی نظام کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کلمہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ، دین کے ارکان ہیں۔ انہی کو پنج بنائے اسلام کہا جاتا ہے۔ اگر ان کی حیثیت ارکان (یعنی ستونوں) کی رہتی جن پر عمارت کی چھت ڈالی جاتی ہے تو یہ بھی معاملہ اپنے مقام پر ٹھیک رہتا۔ اس طرح یہ ستون قرار پاتے جن پر اسلام کے معاشی۔ سیاسی۔ معاشرتی نظام کی عمارت تعمیر ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے جب دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا تو یہی ارکان (ستون) مقصود بالذات قرار پا گئے۔ چنانچہ اب کیفیت یہ ہے کہ ہمارے ہاں صدیوں سے ان ستونوں کو قائم کرنے پر سارا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ اور ان ستونوں پر چھت ڈال کر جو عمارت تعمیر کرنی تھی اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ یہ عقیدہ ہمارے دلوں میں اس شدت سے راسخ ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کے معاشی نظام کے متعلق بات کرے تو اسے جھٹ سے کمیونسٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ تو کافر اور دہریہ

کا مترادف ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ (خود ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی (یا جس سورۃ۔ العلق۔ میں یہ پہلی وحی مذکور ہے) اس میں غلط معاشی نظام کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (۹۶/۶-۷)۔ "اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ جب انسان اپنے آپ کو غنی سمجھتا ہے تو وہ سرکشی اختیار کر لیتا ہے"۔ یعنی افراد کے پاس مال و دولت کی افراط سے وہ نشہ پیدا ہو جاتا ہے جو انسان کو سرکشی پہ آمادہ کر دیتا ہے۔ چونکہ معیشت پر انسان کا اولین دارومدار ہے اس لئے قرآن نے معاشی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی اہمیت کو شروع سے ہی واضح کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے "اسرارِ شریعت" کی ابتداء ہی معاشی نظام کی اصلاح سے کی ہے چنانچہ وہ اس باب کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ

نکتہ ہا از پیرِ رومؒ آموختم　　خویش را در حرفِ او واسوختم

"مال را" گر بہرِ دیں باشی حمول　　نعم مال" صالح" گوید رسول

میں نے یہ نکتہ مولانا رومؒ سے سیکھا جنہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اگر مال کو دین کے نظام کی خاطر حاصل کیا جائے تو وہ مال صالح ہے۔ اس ایک نکتہ میں اسلام کے نظامِ معیشت کی بنا آجاتی ہے۔ یعنی اگر مال و دولت افراد کی ہوسِ زرپرستی کی تسکین کا ذریعہ ہے یا اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ فرد اس مال کو جس طرح جی چاہے صرف کرے، تو یہ مال غیر صالح ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس سے اس نظام کے قائم کرنے کا کام لیا جائے جس کا مقصود تمام نوعِ انسان کی ربوبیت (نشوونما) ہے تو یہ مال صالح قرار پا جائے گا۔

گر نداری اندر ایں حکمت نظر　　تو غلام و خواجہ تو سیم و زر

لیکن اگر تو اس نکتہ کو پیشِ نظر نہ رکھے تو پھر یہی مال و دولت تیرا آقا بن جائے گا اور تو اس کا غلام۔ آپ ان لوگوں کی حالت پر غور کیجئے جن کی زندگی کا مقصد ہی مال و دولت جمع کرنا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہوسِ زر کس طرح ان کی ناک میں نکیل ڈالے انہیں دربدر لئے پھرتی ہے اور کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔

از تہی دستاں کشا دامنتاں　　از چنیں منعم فسادِ آمنتاں

یاد رکھو! قوموں کی تباہی، سرمایہ داری کے نظام کے ہاتھوں ہوتی ہے جس میں ملک کی دولت چند افراد کے قبضہ میں چلی جاتی ہے اور اس پر انہیں ہر قسم کا تصرف حاصل ہوتا ہے۔ یہی نظام، اقوامِ عالم میں باہمی فساد کا موجب ہوتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں، غریب لوگ قوموں کی کامیابی کا باعث بنتے ہیں بشرطیکہ ان کی قوتوں کو صحیح مصرف میں لانے والے افراد ان کے راہ نما بنیں۔

ا

جدت اندر چشمِ او خوار است و بس — کہنگی را او خریدار است و بس

اس قسم کے دولتمندوں میں یہی خرابی نہیں ہوتی کہ وہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اس سے ان میں عجیب نفسیاتی تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس سے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ معاشرہ میں ذرا سی تبدیلی کا تصور ان کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اور جو نظام کہنہ متواتر چلا آ رہا ہے وہ اسی میں اپنی خیریت سمجھتے ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ ہمارا مروجہ اسلام جو ہمارے دورِ ملوکیت اور سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے اور جس کی علمبردار مذہبی پیشوائیت ہے کس طرح ہر نئی بات کو حرام قرار دیتا ہے اور جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اس کی اندھی تقلید میں نجات کا مدار دیتا ہے۔ یاد رکھئے نظام سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا باہمی گٹھ جوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری کو "خدائی سند" عطا کر کے اسے عوام کی یورش سے محفوظ کر دیتی ہے، اور سرمایہ دار طبقہ، مذہبی پیشواؤں کے لئے اوقاف اور وظائف مقرر کر کے ان کی روٹی کا انتظام کر دیتا ہے۔

در نگاہش نا صواب آمد صواب — ترسد از ہنگامہ ہائے انقلاب

اس طبقہ کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انہیں ہر برائی، بھلائی بن کر دکھائی دیتی ہے اور انقلاب کے تصور سے ان کی جان جاتی ہے۔

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد — آبروئے دخترِ مزدور برد

سرمایہ دار، مزدور کی محنت کا پھل کھا جاتا ہے اور اتنا ہی نہیں، قیامت یہ ہے کہ یہ کم بخت اس غریب کی بہو بیٹی کی عصمت بھی لوٹ لیتا ہے۔

در حضورش بندہ می نالد چو نے — بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے

زمیندار۔ جاگیردار۔ مل اور فیکٹری کے مالک، سرمایہ دار کے سامنے، غریب مزدور اپنی مصیبتیں بیان کر کے روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ چیختا ہے۔ چلاتا ہے۔ لیکن اس شقی القلب کے دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

نے بجامش بادہ و نے در سبوست — کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

زمیندار کے گھر میں اناج کے انبار لگے ہوتے ہیں لیکن اس مزدور کے ہاں نہ پیالے میں پینے کا پانی، نہ مٹکے میں کھانے کے لئے آٹا ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ داروں کے لئے محلات تعمیر کرتا ہے۔ اور خود فٹ پاتھ پہ سوتا ہے۔

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست

در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

کس قدر خوش بخت ہے وہ دولت مند جو پوری محنت سے دولت کماتا ہے لیکن اس میں سے اپنی ضروریات کے لئے کم از کم رکھ کر، باقی نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لئے قرآنی نظام کی تحویل میں دے دیتا ہے۔ اس زمانے میں جب نظامِ سرمایہ داری اتنے زوروں پر ہے، ایسی زندگی وہی بسر کر سکتا ہے جس کے دل میں قوانینِ خداوندی کا احترام ہو اور وہ اس تباہی سے خوف کھاتا ہو جو ان کی خلاف ورزی سے قوموں پر آتی ہے۔

تا ندانی نکتۂ اکلِ حلال   بر جماعت زیستن گردد وبال

جس قوم کی سمجھ میں رزقِ حلال کی اہمیت نہیں آتی، اس کے لئے زندگی وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ بظاہر دیکھئے تو اس کے ہاں مال و دولت کی بے حد فراوانی ہو گی۔ ہر طرح کا سامانِ عیش میسر ہو گا۔ لیکن معاشرہ کے اجتماعی نظام پر نگاہ ڈالئے یا افراد کے دلوں میں جھانک کر دیکھئے تو ان میں جہنم کی آگ شعلہ فشاں دکھائی دے گی۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست   چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست

اس جہنم کا محسوس منظر دیکھنا ہو تو یورپ کی اجتماعی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ وہ رزقِ حلال کی اہمیت سے واقف نہیں، اس لئے اسے کسی آن بھی سکون اور اطمینان نصیب نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وحی کی روشنی سے محروم ہے۔ وہ زندگی کے راستوں کو قوانینِ خداوندی کی روشنی میں طے نہیں کرتا۔ اس لئے وہاں ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا ہے۔

او نداند از حلال و از حرام   حکمتش خام است و کارش ناتمام

وہ حرام اور حلال میں تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان باتوں کے فیصلے تنہا عقل کی رو سے کرتا ہے۔ جس چیز کو اس کی عقل (مصلحت) جائز قرار دیتی ہے اسے اختیار کر لیتا ہے۔ جسے وہ ناجائز (غیر سود مند) بتاتی ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ

عقل خود بیں، غافل از بہبودِ غیر   سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ   در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ   (جاوید نامہ)

واضح رہے کہ یہاں "حرام و حلال" میں تمیز کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ وہ سور کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہ چیزیں بے شک حرام اور ناجائز ہیں۔ لیکن یہاں گفتگو ان کے اجتماعی نظامِ معیشت کی ہو رہی ہے۔ جس قوم کے ہاں یہ نظام غیر خداوندی اصولوں کے مطابق قائم ہو گا اس قوم کو رزقِ حلال نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو روپیہ غریبوں کی محنت کو غصب کر کے حاصل کیا جائے، اس سے خریدا ہوا "حلال بکرے کا گوشت" "حلال" کہلانے لگا؟ اس نکتہ کو خود حضرت علامہؒ نے واضح کر دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ یورپ حلال و حرام میں اس لئے

تمیز نہیں کر سکتا کہ اس کے نظامِ معیشت میں کیفیت یہ ہے کہ

اُشترے بر کشتِ دیگر چرد — دانہ ایں می کارد و آں حاصل برد

ایک قوم اپنی کھیتی سے نہیں، دوسری قوم کی کھیتی سے گھاس چرتی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ فصل کوئی بوتا ہے اور غلہ کوئی لے جاتا ہے۔ یہی نظام سرمایہ داری کی بلا ہے۔ اس نظام میں

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

کمزور قوموں کا رزق چھین کر اپنے ہاں لے جانا انتہائی سیاسی کاریگری کہلاتا ہے۔ ان ناتوانوں کے نحیف و نزار جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا جانا۔ تاکہ اس سے اپنی قوم کے قصرِ تعیش کی رنگینی کا سامان بہم پہنچایا جائے ڈپلومیسی قرار پاتا ہے۔ یورپ کی ہر قوم اسی تگ و تاز میں لگی رہتی ہے اور اس کا نام "تہذیب" رکھا جاتا ہے۔

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است — پردۂ آدم دری، سوداگری است

اس تہذیبِ نو کا مسلک کیا ہے؟ انسان کو چیر پھاڑ کر کھا جانا ' اور یہ تمام سبعیت اور درندگی تجارت کے پردے میں کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں اسے "سوداگری" اور ہے یہ "حقیقت قزاقی اور رہزنی"۔

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود

یہ بنکس (BANKS) جن کے بل بوتے پر تجارت کا یہ سارا کاروبار چلتا ہے' یورپ کی انتہائی خون آشام سرمایہ پرست، آدم خور، قومِ یہود کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ انسان کے دل سے، خدا کے نور کو چھین کر لے گئے ہیں۔ اور ساری دُنیا، ظلم و استبداد پر اتر آئی ہے۔ یاد رکھو۔

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جب تک یہ نظامِ سرمایہ داری تہ و بالا نہیں ہوتا، عقل و فکر اور تہذیب و تمدن کا تصور سودائے خام ہے۔ نہیں، اس سے بھی آگے چلئے۔ اس نظام کی موجودگی میں دین کا نام لینا بھی اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ دین اور نظامِ سرمایہ داری دو متضاد عناصر ہیں۔ ایک کی موجودگی میں دوسرا رہ نہیں سکتا۔ اگر نظامِ سرمایہ داری رائج ہے تو دین باقی نہیں رہ سکتا۔

اس کے بعد اگلا بند یوں شروع ہوتا ہے۔

آدمی اندر جہانِ خیر و شر — کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

دنیا میں خیر و شر دونوں موجود ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ انسان تنہا عقل کی رُو سے اضافی خیر اور شر کو تو معلوم کر سکتا ہے لیکن مطلق خیر اور شر کا معلوم کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ وحی کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ ہر فرد کی عقل اسے یہ بتائے گی کہ تیرے فائدے کی بات کونسی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہوگی کہ نوعِ انسان کا

فائدہ کس بات میں ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جس بات کو ایک فرد کی عقل اس کے لئے فائدہ مند بتلائے وہی درحقیقت اس کے فائدے کی نہ ہو۔ ذرا آگے چل کر معلوم ہو کہ وہ فائدہ مند نہیں نقصان رساں تھی۔ جو کیفیت افراد کی ہے وہی اقوام کی ہے۔

کس نداند زشت و خوب کار چیست جادۂ ہموار و ناہموار چیست

وحی کی روشنی کے بغیر کوئی نہیں جان سکتا کہ کاروانِ انسانیت کے لئے وہ صحیح راستہ کون سا ہے جو اسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ چیز صرف شریعتِ حقہ (دینِ خداوندی) کی رو ہی سے ممکن ہے جس کا سرچشمہ عقلِ انسانی سے ماوراء ہے۔

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات روشن از نورش ظلامِ کائنات

وحی کی ماہیت کے متعلق غیر از نبی کچھ نہیں جان سکتا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ وحی، خدا کی طرف سے نبی پر نازل ہوتی ہے۔ وحی علمِ خداوندی پر مبنی ہے۔ اس کا سرچشمہ وہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اسے (اپنے فلسفیانہ انداز میں) یوں تعبیر کرتے ہیں کہ وحی کا سرچشمہ "حیات کی گہرائیاں" ہیں۔ اسی کو وہ ضربِ کلیم میں یوں بیان کرتے ہیں کہ راز زندگی معلوم نہیں ہو سکتا۔

گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

ہم ان فلسفیانہ بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتے کیونکہ ہمارا مخاطب طبقہ بیشتر وہ ہے جو ان مباحث سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہم یوں کہیں گے کہ وحی کا سرچشمہ وہ ذاتِ خداوندی ہے جو خود حیات (LIFE) کا بھی سرچشمہ ہے۔ وحی سے کائنات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور زندگی کے راستے روشن ہو جاتے ہیں۔

گر جہاں داند حرامش را حرام تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

اگر نوعِ انسانی، وحی کو جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا معیار قرار دے لے، تو اس کے مطابق جو نظامِ زندگی قائم ہو وہ ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ رہے لیکن

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر با نگاہے دیگرے او را نگر

یہ نظام کیا ہے؟ اس کے بنیادی خط و خال کون سے ہیں۔ یہ کس طرح قائم ہوگا۔ یہ باتیں اہلِ فقہ سے پوچھنے کی نہیں۔ ہماری فقہ، عباسیوں کے دورِ ملوکیت میں قائم ہوئی۔ جس میں سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا غلبہ تھا۔ جو قوانین اس دور میں وضع ہوئے، وہ ہمیں کیا بتا سکیں گے کہ قرآنی نظام کیا ہے؟ اس لئے کہ قرآنی نظام تو ملوکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس نظام کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس دور سے پیچھے ہٹ کر عہدِ نبی اکرمؐ کی طرف جانا ہوگا۔

رابطۂ باہمی

طلوع اسلام کنونشن (۱۹۶۳ء) میں، ہال اور درسگاہ کی تعمیر کے متعلق جو اسکیم زیر تجویز تھی، اس سلسلہ میں مجھے بزموں کی طرف سے اور بعض احباب کی طرف سے حسب ذیل رقوم موصول ہوئی ہیں۔ اس فہرست کو اس غرض سے شائع کیا جاتا ہے کہ متعلقہ بزمیں اور احباب اسے چیک کرلیں اور اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے یا کسی کا نام درج فہرست ہونے سے رہ گیا ہو تو مجھے مطلع فرما دیا جائے تاکہ حساب درست کرلیا جائے۔ آئندہ کنونشن میں مکمل فہرست پیش کی جائے گی جس میں درج ہوگا کہ اس سلسلہ میں وعدے کس قدر ہوئے تھے اور ان میں سے وصولی کس قدر ہوئی ہے۔ نیز اس اسکیم سے متعلق مزید مشورے بھی کنونشن میں کئے جائیں گے۔ (میاں عبدالخالق)

(آنریری مینیجنگ ڈائرکٹر۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور)

۱	محترمہ بیگم نواب الدین چینیوٹ	۱۰ روپیہ	
۲	محترم مراد علی دارسک	۱۰	"
۳	محترم محمد حسین پشاور چھاؤنی	۱۰	"
۴	محترم نمائندہ بزم سبیدھن	۲۰	"
۵	محترم اللہ دتا منڈی ویلونا	۲۵	"
۶	محترم ابو عاکف کشتی کراچی	۴۰	"
۷	محترم محمد شفیع بٹ۔ چونڈہ	۵۰	"
۸	محترم محمد شفیع چوہدری بزم طلوع اسلام لاہور	۸۰	"
۹	محترم سید امین کندیاں معرفت ادارہ	۱۰۰	"
۱۰	محترم فضل کریم مردان	۱۰۰	"
۱۱	محترم مقبول احمد چوہدری ہیڈ کانسٹیبل ڈیرہ غازیخان	۱۰۰	"
۱۲	محترم قاسم بھائی بزم طلوع اسلام کراچی	۱۰۰	"
۱۳	محترم شیخ محمد اقبال بزم طلوع اسلام گوجرانوالہ	۱۰۰	
۱۴	محترم ملک ضیاء اللہ۔ ڈسکہ	۱۰۰	
۱۵	محترم شیخ محبوب الٰہی وکیل	۱۰۰	
۱۶	محترم خواجہ محمد حسین بزم طلوع اسلام لاہور	۱۰۰	"
۱۷	محترم غلام مرتضےٰ خاں۔ سرگودھا	۱۰۰	"
۱۸	محترم وزیرزادہ نیاز محمد خاں ڈیرہ اسمٰعیل خان	۱۰۰	"
۱۹	محترم فقیر محمد مخمور بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	۱۲۵	"
۲۰	محترم نظام بخش ڈیرہ اسمٰعیل خاں	۲۰۰	"
۲۱	محترم صوبیدار عبدالمجید چک نمبر ۳۷،	۲۰۰	"
۲۲	محترم عبدالحمید خان معرفت گرنڈلے بنک کراچی	۲۰۰	"
۲۳	محترم قمر بٹ بزم طلوع اسلام لاہور	۵۰۰	"
۲۴	محترم محمد صادق بزم طلوع اسلام گوجرانوالہ	۵۰۰	"
۲۵	بزم طلوع اسلام راولپنڈی	۵۰۰	"
۲۶	بزم طلوع اسلام بوریوالہ	۵۰۰	"
۲۷	محترم راجہ محمد اکرم ایڈووکیٹ لاہور	۱۰۰۰	"
	کل میزان	۵۱۷۰ روپیہ	

بزم ہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

لاہور بزم پورے عزم اور ولولے سے سرگرم کار ہے اور اس کے زیر اہتمام ہر اتوار کو ۲۵ بی۔ گلبرگ میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن باقاعدگی سے جاری ہے۔ اندرون شہر سے گلبرگ تک درس قرآن میں شرکت کی سہولت پہنچانے کے لئے بزم نے "طلوع اسلام اسپیشل" کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ اور گاہے بگاہے اہم موضوعات پر مفکرِ قرآن کے خطاب کے لئے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں بھی جلسے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں ۹ فروری کو مذکورہ ہال میں ایک اہم اجتماع ہوا جسے پرویز صاحب نے مخاطب فرمایا۔ خطاب کا موضوع تھا ــــ "عید کیوں منائی جاتی ہے؟" نزولِ قرآن کے اس سالانہ جشنِ عید پر مفکرِ قرآن نے اس حسنِ انداز سے روشنی ڈالی اور اس موضوع کے مختلف گوشوں کی اس دلبرانہ جذب و مستی سے نقاب کشائی کی کہ جلسہ گاہ کی پوری فضا میں تاثر کا ایک سماں بندھ گیا۔ خطاب کے دوران میں بار بار ایسے مرحلے بھی آئے کہ مفکرِ قرآن کی اپنی آواز جوشِ تاثر سے بھرا گئی اور موثر خطابت کی شدت سے حاضرین کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ خطاب کے بعد پرویز صاحب نے بڑے اہم سوالات کے جواب بھی دئے۔ جن سے کچھ اور گوشے نکھر کر سامنے آگئے اور حاضرین نے ایک بار پھر اس حقیقت کو محسوس کیا کہ قرآن کے اس عظیم طالب علم کو انسانی زندگی کے بے پایاں مسائل پر کس قدر گہرا عبور حاصل ہے۔

۱۲ فروری کو پرویز صاحب کی قیامگاہ (۲۵۔ بی۔ گلبرگ) میں جشنِ نزولِ قرآن کا شایانِ شان اہتمام تھا۔ ان کی قیامگاہ رنگارنگ برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ اور صوبائی دارالسلطنت کے ہر حلقہ کے صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق احباب ہر شام ہی سے کشاں کشاں نور و نکہت سے اس جھومتی ہوئی فضا میں پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے پرویز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں جشنِ نزولِ قرآن کے مالہ و ماعلیہ پر روشنی ڈالی۔ پھر کلامِ اقبالؒ سے حاضرین کو نوازا گیا۔ اس کے بعد حاضرین کے لئے کھانے کا انتظام تھا۔ الغرض رات گئے تک نزولِ قرآن کے جشن کی یہ سرور انگیز مجلس جمی رہی اور حاضرین کے لئے شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان میسر رہا۔

کراچی بزم کے احباب پوری ہم آہنگی اور اخوت سے دعوتِ قرآنی کی اشاعت میں لگے ہیں۔ سندھ اسمبلی ہال میں ٹیپ ریکارڈ کی وساطت سے ہر اتوار کو پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا باقاعدہ اہتمام ہوتا ہے اور شہر کے ہر حصے سے صاحبِ ذوق حضرات بڑی بھاری تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ بزم کی طرف سے لٹریچر کی تقسیم کا بھی معقول انتظام ہے۔ اور ان کوششوں کی بدولت قرآن کی آواز کراچی کے گلی کوچوں میں سرعت سے پھیل رہی ہے۔

۲۲ فروری کو بزم نے جشنِ نزولِ قرآن کے سلسلے میں حسبِ سابق ایک شایانِ شان تقریب کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس مبارک تقریب کی بدولت قرآن کریم کی عظمت کے مختلف پہلو نکھر اور ابھر کر سامنے آتے رہتے ہیں۔

ملتان محترم مزاج میر اور دیگر احباب کی کوششوں سے بزم کا جمود ٹوٹ چکا ہے اور ۳۱ جنوری کے اجلاس کے بعد تمام احباب از سر نو سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ حسب سابق بزم کی نمائندگی کے فرائض محترم غلام محی الدین خاں صاحب ادا کریں گے۔ (ان کا پتہ ہے۔ بالمقابل گورنمنٹ ہائی اسکول نواں شہر ملتان)۔

اک شمع اور بجھی!

گزشتہ جنوری کے آخری ایام میں ہمارے محترم سید نصیر شاہ صاحب کے والد محترم کی وفات حسرت آیات نے ہم سے ایک گرانقدر عالم دین کو چھین لیا۔

محترم مولانا سید امیر شاہ صاحب مرحوم و مغفور اس دور کے صاحب فکر علمائے دین میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے خلافت اور استقلالِ پاکستان کی تحریکوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ایک حق گو عالم دین کی حیثیت سے ان کی خطابت میں جادو کا سا اثر تھا اور عربی زبان پر انہیں اس قدر دسترس حاصل تھی کہ ان کے مضامین مصر، شام، حجاز اور عراق کے چوٹی کے جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے ہر قسم کی شہرت سے بے نیاز ہو کر پورے خلوص سے زندگی بھر دین کی خدمت کا حق ادا کیا۔ جیسا کہ سید نصیر شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مرحوم کی زندگی کا بڑا حصہ قدامت پسندی کے مسلک سے وابستہ رہا۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے طلوع اسلام اور پرویز صاحب کی دعوت قرآنی کا مطالعہ شروع کیا۔ وہ اس نے ان کی زندگی میں وہ انقلاب پیدا کیا جو بھری مجلس میں اکثر فرمایا کرتے کہ

"خدا بھلا کرے اس شخص کا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر بتایا کہ قرآن بھی غور کرنے کی چیز ہے"

ہمیشہ طلوع اسلام کے انتظار میں رہتے اور جب "تازہ شمارہ ملتا تو اسے ختم کئے بغیر نہ چھوڑتے۔ انہیں محترم پرویز صاحب کے زیر ترتیب شاہکار "اسلام کیا ہے؟" کی اشاعت کا شدید انتظار تھا اور یہ انتظار انہیں آخری سانس تک رہا۔ ادارہ طلوع اسلام اس حادثہ کو ملک و ملت کا ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے اور محترم سید نصیر شاہ صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

شریک غم ادارہ **طلوع اسلام** لاہور

حقائق و عبر

اختلاف کے فائدے

آپ نے یہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک صاحب اپنی تقریر میں "اتفاق" کے نقصانات بیان کر رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ دیکھو! اتفاق سے ریل گاڑیاں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں اور سینکڑوں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ اتفاق سے مکان گر جاتا ہے اور پورے کا پورا خاندان نیچے آکر مر جاتا ہے۔ اتفاق سے آدمی کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ اور اسے کتنی چوٹیں آجاتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو تھے اتفاق کے نقصانات۔ اب آپ ذرا اختلاف کے فوائد ملاحظہ فرمایئے۔ یہ تقریر نہیں ایک مقالہ ہے جو ۳۰ جنوری کے نوائے وقت میں شائع ہوا ہے۔ اور لکھنے والے ہیں مولانا کوثر نیازی صاحب۔ تحریر ہے:-

"عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ علمائے کرام کے درمیان بہت سے اختلافات ہیں اور ایک عام شخص ان کے اختلافات دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ کس کی رائے کو درست تسلیم کرے۔ اور کس کی رائے کو غلط قرار دے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آدمی مذہب کے جھگڑے میں نہ پڑے۔ اختلاف بذاتِ خود بُری چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو مخلوق اور چیزیں بنائی ہیں ان میں اختلاف موجود ہے۔ اگر اختلاف بُری چیز ہوتی تو اللہ کی مخلوق میں اختلافات نہ ہوتے۔ انسان ایک ہی طرز پر پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں انہیں کوئی گن بھی نہیں سکتا۔ لیکن اللہ نے انسان کے ظاہر میں ہی اتنا اختلاف رکھ دیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا جاتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے تو اختلاف کو وجودِ باری تعالیٰ کی دلیل قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کتنے ہی انسان پیدا ہوئے ہیں اور وہ سب شکل و صورت آواز اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کیا اتنے متنوع

انسان خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔ انہیں پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان کے اجزاء ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ان میں اس قدر اختلاف ہے کہ اس کی مدد سے ان کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ جدید فنی معلومات کی روشنی میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان کی مدد سے مجرموں کو پکڑا جاتا ہے اور یہ بات صرف انسان تک ہی محدود نہیں۔ ایک ہی قسم کے پھول ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ٹہنیاں بظاہر ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ اختلاف بذات خود بُری چیز نہیں ورنہ انسانی عقل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ فہم مختلف ہے۔ غرض یہ کہ دنیا کے ہر شعبۂ زندگی میں اختلاف موجود ہے۔ گھر میں اختلاف ہے۔ دفتر میں اختلاف ہے باپ بیٹے اور ماں بیٹی میں اختلاف ہے۔ خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں اختلاف کو مخالفت کا رنگ دے دیا جائے۔ اور انتشار و افتراق وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دوسرے کی سوچ کو غلط اور اپنی فکر کو عین اسلام اور صحیح قرار دیا جائے۔ دراصل خرابی کی یہی بنیاد ہے ورنہ اختلاف کوئی بُری چیز نہیں۔

علماء میں پہلے بھی اختلافات تھے اور وہ ایک دوسرے کی رائے و فکر سے اختلاف رکھتے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ اختلاف بالکل اسی قسم کا تھا جس قسم کا اختلاف مجسٹریٹوں۔ سیشن یا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں میں ہوتا ہے۔ ضلع کچہری میں ایک مقدمہ میں کسی ملزم کو سزا دی جاتی ہے اور سیشن یا ہائی کورٹ اسے بری قرار دیتے ہیں۔ ایک ہی قانون کے تحت ایک ہی مقدمہ میں سیشن اور ہائی کورٹ کے فیصلے بسا اوقات مختلف ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے علماء میں جو اختلافات ہوتے تھے وہ مخالفت کے رنگ میں نہیں تھے۔ اور ان کی وجہ سے افتراق نہیں پھیلا ہوگا۔ علماء اختلاف کی بنا پر امت کو لڑاتے نہیں تھے۔ گروہ نہیں بناتے تھے۔ اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے سے لڑتے نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے علم کا اعتراف کرتے اور باہم دگر احترام کرتے تھے۔

مشہور واقعہ ہے حضرت امام شافعیؒ رفع یدین کے قائل تھے ایک بار وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی قبر پر گئے۔ فاتحہ خوانی کی۔ پھر وہیں نماز پڑھی اور رفع یدین نہیں کیا۔ ایک شخص نے آپ سے استفسار کیا کہ جناب آپ نے رفع یدین نہیں کیا۔ حضرت امام شافعیؒ نے جواب دیا مجھے اس قبر والے (امام ابو حنیفہؒ) سے شرم آتی ہے۔ کیونکہ رفع یدین ان کا مسلک نہیں۔ اس لئے یہاں رفع یدین کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اس وقت کے علماء اور اکابرین میں رواداری۔ کشادہ دلی۔ اور فراخ حوصلگی موجود تھی جو آجکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور ان میں اپنی بات کو درست اور دوسرے کی بات کو غلط قرار دینے کا رجحان حد درجہ سے متجاوز ہو گیا ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ میری بات درست ہے اور اس کے باہر جو کچھ بھی ہے وہ

الحاد ہے، زندقہ ہے کفر ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ ایک آقا نے اپنے نوکروں کو پانی لانے کے لئے کہا اور اپنے اس حکم کی کوئی تشریح نہیں کی۔ چنانچہ ایک نوکر نے یہ سمجھا کہ شاید وضو کے لئے پانی طلب کیا ہے۔ وہ لوٹے میں پانی لے آیا۔ دوسرے نے سمجھا پینے کے لئے پانی طلب کیا ہے۔ اس لئے وہ گلاس میں پانی لے آیا۔ اور تیسرا نوکر (اپنی فہم کے مطابق) نہانے کے لئے پانی لے آیا۔ غرض آقا نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں ایک ہی بات درست ہو گی۔ لیکن آقا اپنے دوسرے نوکروں کو نمک حرام نہیں کہے گا۔ اور نہ ہی انہیں نکال دے گا۔ کیونکہ ہر نوکر نے اپنی فہم و فکر اور استطاعت کے مطابق اس کے حکم پر عمل کیا ہے۔

اسی طرح اللہ اور رسولؐ نے ایک حکم دیا اور ائمہ کرام نے اپنی فہم اور فکر کے مطابق اس کی تشریح کی اور جس نے جس امام کی تشریح کو درست سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رضا سے نوازے گا۔ یہ بات کہ علماء اور ائمہ کرام کے اختلاف کی وجہ سے دین کو ہی چھوڑ دیا جائے سراسر غلط ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا سوچنے والے دین کی اہمیت محسوس نہیں کرتے ورنہ دنیاوی امور میں وہ اختلافات کے باوجود اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ عمل نکال ہی لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور متفق ہو جاؤ۔ اللہ نے اتفاق کی تلقین کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اتفاق اللہ کی رسی پکڑنے پر ہے۔ اللہ کی رسی پکڑنے میں اتفاق کی تلقین کی گئی ہے۔ شیطان کی رسی پکڑنے میں نہیں کہ اکثریت ادھر جا رہی ہے اس لئے علماء کو بھی ادھر ہی جانا چاہیئے۔ اللہ کی رسی قرآن و سنت ہے۔ اگر علماء ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جو قرآن و سنت پر قائم ہیں تو یہ اختلاف رحمت ہے (؟) اور یہ اختلاف قرآن و سنت میں عین مطلوب ہے۔ ہمارے دوست ججوں کے اختلاف۔ درزیوں کے اختلاف اور ماہرین قانون و تعلیم کے اختلافات کی بنا پر انہیں ترک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ صرف علماء کے اختلاف پر بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ اصل میں اس پروپیگنڈے میں اہل غرض کا ہاتھ ہے۔"

<u>طلوع اسلام</u>

یہ اس اختلاف کے فوائد گنائے جا رہے ہیں جسے قرآن کریم خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔۔۔۔ (۳:۱۰۵)

(مسلمانو!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے بنا لئے اور باہمی اختلاف کیا۔

بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح تعلیمِ خداوندی آچکی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

اور جن میں اختلاف نہیں ہوتا ان پر خدا کی رحمت بتاتا ہے۔ سورۂ ہود میں ہے کہ اگر خدا چاہتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سب کو ایک ہی راہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے انسان کو اختیار و ارادہ عطا کیا ہے کہ ہر شخص اپنے فیصلے کے مطابق اپنے لئے راستہ اختیار کرے۔ اس وجہ سے لَا یَزَالُونَ مُخْتَلِفِینَ ۔ لوگ باہمی اختلاف کرتے رہیں گے اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ ۔ ہاں مگر وہ لوگ اختلاف نہیں کریں گے جن پر خدا کی رحمت ہو گی۔ وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ ۔ (۱۱/۱۱۸)۔ اور منشائے تخلیق بھی یہی ہے کہ لوگ اختلاف نہ کریں بلکہ ایک امت بن کر رہیں۔ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس سے اختلاف مٹایا جائے وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ (۱۶/۶۴) "اور یہ کتاب ہم نے تجھ پر نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو ان باتوں کو واضح کر دے جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں"۔ اس لئے اختلاف مٹانے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ خدا کے ہاں سے لے لیا کرو۔ یعنی قرآن کریم سے (۴۲/۱۰)۔ اس نے قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل یہ بتائی ہے کہ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲) اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

باقی رہا یہ کہ "پہلے علماء اختلاف کی بنا پر امت کو لڑاتے نہیں تھے۔ گر وہ نہیں بناتے تھے۔ اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے سے لڑتے نہیں تھے" تو اس باب میں جس قدر کم زبان کھولی جائے اچھا ہے۔ دیگر سینکڑوں بلکہ ہزاروں واقعات کو تو چھوڑ دیئے، صرف ایک مسئلہ خلق قرآن کے اختلاف پر جس قدر امت کا خون بہایا گیا ہے، بغداد کی گلیوں کا ذرہ ذرہ اس کی شہادت دیتا ہے ـــــ اختلاف نہ پہلے رحمت تھا نہ اب رحمت بن سکتا ہے۔ وہ پہلے بھی خدا کا عذاب تھا اور اب بھی خدا کا عذاب ہے۔ اور تباہی کا موجب، جیسا کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ

لا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا فهلکوا (جمع الفوائد)

آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو۔ تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تو وہ تباہ ہو گئے۔

۲۔ تلاعب بالدین

دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ تذکرہ کی فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں معارف و حقائق

کے زیرِ عنوان حسب ذیل نوادرات شائع ہوئے ہیں۔

(۱) امام شافعیؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میری بیوی کے پاس ایک کھجور تھی۔ میں نے اس کو یہ کہہ دیا کہ اگر تو نے یہ کھجور کھائی تو تجھ پر طلاق اور اگر پھینک دیا تب بھی طلاق۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا کہ آدھی کھا لے اور آدھی پھینک دے۔ (حرملہ بن یحییٰ)

(۲) ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ جو پانی میں کھڑی ہوئی تھی کہ اگر تو اس پانی میں ٹھہری تو تجھ پر طلاق اور نکلی تب بھی طلاق۔ تو ہم دیکھیں گے کہ اگر پانی جاری تھا اور اس شخص نے کوئی خاص نیت نہیں کی تھی تو اس پر طلاق واقع نہ ہوگی چاہے وہ نکل آئے یا کھڑی رہے۔ لیکن اگر وہ پانی کھڑا ہوا تھا تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اسے فوراً کوئی دوسرا شخص زبردستی اٹھا کر پانی سے باہر لے آئے۔ (کتاب الاذکیا)

(۳) ایک شخص نے اپنی بیوی کو جو کہ سیڑھی پر تھی یہ کہا کہ اگر تو اس سیڑھی پر چڑھی یا اس سے نیچے اتری یا تو نے اپنے آپ کو نیچے گرایا یا کسی نے تجھے نیچے اتارا تو تجھ پر طلاق ہے۔ تو اس سے رہائی کی صورت یہ ہوگی کہ ایک سیڑھی اس کے برابر رکھ دی جائے اور وہ اس سیڑھی پر منتقل ہو جائے۔

(۴) ایک شخص نے گھر والوں کے ساتھ مل کر بہت سی کھجوریں کھائیں پھر بیوی سے یہ کہہ دیا کہ اگر تو نے میرے سامنے کھجوروں کی ان تعدادوں کا ذکر نہ کیا جو میں نے کھائی ہیں تو تجھ پر طلاق۔ اس سے رہائی کی یہ صورت ہوگی کہ جس قدر کھجوریں کھانے کا زیادہ سے زیادہ احتمال ہو وہ عورت ایک سے لے کر اس عدد تک گنتی چلی جائے۔ اس گنتی میں صحیح عدد بھی اس کے سامنے مذکور ہو ہی جائے گا۔

(۵) ایک شخص نے اپنی بیوی کے پاس پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ دیکھا تو اس نے کہا یہ پانی مجھے پلا دو۔ اس نے انکار کیا تو اس شخص نے کہا اگر تم نے اس پانی کو پیا یا اس کو گرایا۔ یا اس پیالہ میں چھوڑ دیا۔ یا کسی اور کو پلا دیا تو تم پر طلاق۔ تو اس سے رہائی کی یہ صورت ہوگی کہ اس پیالہ میں کوئی ایسا کپڑا ڈال دیا جائے جو اس پانی کو جذب کر لے۔

طلوعِ اسلام

قرآن کریم نے طلاق کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ

وَلَا تَتَّخِذُوْا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا (۲/۲۳۱)

احکامِ خداوندی سے مذاق مت کیا کرو۔

۳۔ بہ صد چشمِ نم!

روزنامہ مشرق (لاہور) بابت ۸، فروری سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع شدہ ایک خبر۔

"گزشتہ شب چشتیاں کی گیارہ سالہ بچی بلقیس بیگم میو ہسپتال میں انتقال کر گئی۔ پانچ روز قبل اس کی

معہ والدہ فضل بی بی اور اس کا بھائی بشیر نہایت کس مپرسی کی حالت میں اسے لے کر لاہور پہنچے تھے۔ اور ایک تانگے والا ان کا وہ صندوق لے کر فرار ہو گیا۔ جس میں فضل بی بی کے بیان کے مطابق ضروری کپڑوں کے علاوہ بچی کا کفن بھی رکھا تھا۔ فضل بی بی نے نمایندہ مشرق کو بتایا کہ ہسپتال میں بلقیس تو داخل ہو گئی مگر اس کے ساتھ مجھے نہیں رہنے دیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں دو دن تک بچی کی شکل دیکھنے سے محروم رہی۔ اور ہسپتال کے گیٹ پر پڑی ہر آنے جانے والا کا منہ دیکھتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے سُنا تھا کہ لاہور میں اہل دل حضرات کی کمی نہیں مگر میری مصیبت میں کسی نے میری حوصلہ افزائی نہ کی۔ اور میری بچی کا کفن تک چھین لیا ———

مرحوم بلقیس بیگم کے بھائی بشیر نے بتایا کہ اخبار میں ہماری داستان سُن کر ایک صاحب نے مجھے سات روپے دئے۔ جو میں نے قرض حسنہ سمجھ کر قبول کر لئے۔ اس نے کہا کہ لاہور میں ہمارا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ والدہ کے لئے کھانے پینے اور بیمار بہن کی ضروریات کا انتظام کرنا بہر حال میرے ذمہ تھا۔ جس کی تکمیل کے لئے میں نے دو دن تک لاہور میں مزدوری تلاش کی اور مارا مارا پھرا مگر کسی نے بھی مجھے مزدوری نہ دی اور میری والدہ دو دن تک فاقوں کا شکار رہی اور میں نے لنڈے بازار میں اپنے جوتے اور پگڑی فروخت کی اور والدہ اور اپنے لئے روٹی کا انتظام کیا۔"

اس کے بعد خبر میں کہا گیا ہے کہ دوسرے دن اس بچی کا انتقال ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس لاہور میں ہوا جس میں خیر سے اس رسولؐ کے لاکھوں نام لیوا بستے ہیں جس نے فرمایا تھا کہ

جس بستی میں ایک فرد نے رات بھوکے بسر کی اس بستی کی حفاظت کی ذمہ داری خدا کے ہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔

اور یہ اس رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا جبکہ ایک ایک مسجد میں ختم قرآن کریم پر ہزاروں روپے تزئین و آرائش پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اللہ! جلالت اسلام کا کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

خریدار توجہ فرمائیں

جن احباب کا چندہ ختم ہو جاتا ہے ان کے نام جو رسالہ بھیجا جاتا ہے اس میں پہلے صفحہ پر ایک مطبوعہ کارڈ لگا دیا جاتا ہے۔ جس میں اس امر کی اطلاع ہوتی ہے کہ ان کا چندہ ختم ہو گیا ہے۔ اور یہ بھی درج ہوتا ہے کہ آپ اس کی غیر ضروری شقیں کاٹ کر، کارڈ کو بغیر ٹکٹ لگائے پوسٹ کر دیں۔ ہم اس کارڈ کا متعلقہ مہینے کی پندرہ تاریخ تک انتظار کرتے ہیں۔ اگر اس وقت تک کوئی جواب نہیں آتا تو پھر رسالہ کی وی۔پی بھیج دی جاتی ہے جس کا چھڑانا آپ حضرات کا اخلاقی فرض ہوتا ہے اسے نوٹ فرمالیں۔

۲۔ ادارہ سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ والسلام۔

(ناظم ادارہ)

نقد و نظر

۱- لمحات (عربی)

(سلاق) سندھ کے ایک معزز خاندان کے وقف سے حیدرآباد میں شاہ ولی اللہؒ اکادمی کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے جس کا مقصد شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کی تعلیم کی نشر و اشاعت ہے۔ اکادمی کی طرف سے الرحیم ماہنامہ بھی شائع ہوتا ہے اور شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف کی طباعت و اشاعت کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ زیر نظر رسالہ، شاہ صاحب کے فلسفۂ تصوف کی بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے بڑی محنت سے تصحیح کر کے حواشی اور مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے اس میں شاہ صاحب نے "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے اس پر بحث کی ہے۔ اور ابن الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ رسالہ ٹائپ میں چھپا ہے۔ ضخامت قریب ۱۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپیہ۔

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ ان ہستیوں میں سے ہیں جن کے علمی کارناموں میں دیر تک زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن ہر دور کے انسان کی طرح وہ بھی اپنے زمانے کے حالات سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کے ہاں جہاں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جو ہمارے لئے بہت مفید ہیں اور قرآن کریم کی رو سے جن کے صحیح ہونے میں کلام نہیں وہاں (ان کے ہاں) ایسے امور بھی موجود ہیں جن کی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ نہ ہی وہ ہمارے لئے کسی فائدے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ شاہ صاحب کا تصوف (اور تصوف کسی کا ہو اس کی حیثیت یکساں ہے) کا شمار اسی زمرہ میں ہوتا ہے۔ یہ ان کے ذاتی خیالات تھے جن کی حیثیت اب آثار قدیمہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ہم اکادمی کے ارباب نظم و نسق سے گزارش کریں گے کہ وہ شاہ صاحب کی ان چیزوں کو شائع کریں جن کی سند قرآن مجید سے ملتی ہے اور وہ ہمارے موجودہ مسائل کے حل کرنے میں مفید ہو سکیں۔ درحقیقت کرنے کا کام یہ تھا کہ یہ حضرات قرآن کریم کی نشر و اشاعت کے لئے اکادمی قائم کرتے اور اس سلسلہ میں منجملہ دیگر حضرات، شاہ صاحبؒ نے جو

خدمات سرانجام دی ہیں انہیں سامنے لاتے۔ اس طرح یہ ادارہ شخصیت پرستی سے بچ کر قرآن کے ابدی حقائق کو عام کرنے کی نہایت مفید خدمت سرانجام دے سکنے کے قابل ہو سکتی تھی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خالص قرآن کے لئے نہ ابھی کوئی کچھ دینے کے لئے تیار ہے۔ نہ کوئی کچھ کرنے کے لئے آمادہ۔ ابھی مسلمان شخصیتوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ اور جب تک یہ اس دائرے سے باہر نہیں نکلے گا' دین خالص اس کے سامنے نہیں آسکے گا۔

۲۔ ماہنامہ میثاق

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی' علمی اور مذہبی حلقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر۔ اعظم گڑھ) چھوڑنے کے بعد' پہلے جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔ اور اس سے اعتزال کے بعد اب لاہور میں آزادانہ علمی اور مذہبی مشاغل میں مصروف ہیں۔ زیر نظر ماہنامہ انہی کی زیر ادارت (اچھرہ۔ لاہور سے) شائع ہوتا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ ۶ روپے ہے اور قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے۔

مولانا اصلاحی' ہمارے زمانے کے ایک جلیل القدر عالم قرآن' مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ مولانا مرحوم کا انداز فکر یہ تھا کہ وہ قرآنی مفردات کے معانی' زمانہ قبل از اسلام (شعرائے جاہلیہ کے کلام) سے متعین کر کے تصریف آیات سے قرآنی مفہوم متعین کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کا یہ انداز بہت صحیح ہے مولانا اصلاحی بالخصوص اس روش کے پابند نہیں لیکن جہاں جہاں ان کے ہاں استاد محترم کے فکر کی روشنی آجاتی ہے' ان مقامات میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر مولانا اصلاحی اسی روش کو اور آگے بڑھاتے تو زیادہ مفید خدمت سرانجام دے سکتے تھے۔ لیکن — اس میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں — یہ مقام وہ ہیں جہاں انسان کو روش عامہ سے ہٹنا پڑتا ہے اور قدامت پسند طبقہ کے لئے یہی چیز مشکل ہے۔ بایں ہمہ رسالہ کا عام انداز متین اور سنجیدہ ہے اور اس میں علامہ فراہیؒ کے افادات بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب کی تصانیف۔

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

سے براہ راست بھی مل سکتی ہیں۔

قتلِ مرتد

(ایک دینی اور علمی بحث)

(محترم رفیع اللہ خاں صاحب)

احترام انسانیت، خود انسانیت کی جان ہے۔ کوئی تہذیب جس کی بنیاد احترام انسانیت پر نہ ہو پھل پھول نہیں سکتی۔ اور جلد ہی زوال پذیر ہو جاتی ہے لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اقتدار پسند لوگ اپنے جھوٹے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے مذہب کے نام پر بھی کشت و خون کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ اسلام جس نے عربوں جیسی خونخوار قوم کو احترام انسانیت کا سبق دے کر اخلاقی بلندیوں پر چڑھایا۔ اگر اسی اسلام کا نام لے کر کشت خون کا جواز نکالا جائے۔ تو طبیعتیں یقیناً پریشان ہوں گی۔ مرتد کے قتل کا مسئلہ اسی قبیل سے ہے۔

اسلام میں کسی انسان کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔ قرآن مجید نے ناحق قتل کو قتلِ انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا۔ اس لئے کسی کے قتل کا فیصلہ کرتے وقت یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ان تمام احکام کو سامنے رکھیں جو اسلام نے اس سلسلے میں فرمائے ہیں۔

مودودی صاحب نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ایسے تمام احکام جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ کیا واقعی انہوں نے تمام احکام جمع کر دیئے ہیں اور جو جمع کئے ہیں کیا وہ اسلامی احکام ہیں۔ یا اسلامی احکام کے پردے میں قتلِ ناحق کا جواز نکالنے کی کوشش کی ہے۔

یہ بات ہمارے حیطۂ تصور سے بالا ہے کہ قتل جیسے اہم معاملہ کی بابت جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قدر سنگین جرم ہے۔ واضح احکام قرآن مجید میں نہ ہوں۔ قرآن مجید میں مرتد کا ذکر اور حکم تقریباً ایک درجن مواقع پر آیا ہے لیکن مودودی صاحب نے ان میں سے ایک آیت بھی پیش نہیں کی۔ اگر کوئی پیش کی ہے تو ایسی جس کا اس مسئلہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور پھر اس سے بھی انہوں نے معنوی تحریف کے ذریعہ اپنا مطلب نکالنے

کی کوشش کی ہے۔ وہ آیت اور اس کا جو ترجمہ اور مفہوم مودودی صاحب نے پیش کیا ہے، حسب ذیل ہے۔

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین ونفصل الایات لقوم یعلمون۔ وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون۔ (۹/۱۱)

پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آجائیں۔ (التوبہ ۹-۲)۔

یہ آیت سورۂ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اعلان برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور اس کے رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کرلیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو قبول کرلیں۔ معاف کردیئے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں۔ مدت مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو اور نہ ملک چھوڑا ہو ان سے جنگ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ اگر وہ توبہ کرکے اور نماز اور زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں کہی جاسکتی۔ بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کے معنی اقرار اسلام سے پھر جانا متعین کر دیتا ہے اور اس کے بعد فقاتلوا ائمۃ الکفر کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۹-۱۰)

مودودی صاحب جو چاہیں اسے وہی مفہوم پہنا سکتے ہیں۔ تاہم یہ معنی نہ تو سیاق عبارت سے نکلتے ہیں اور نہ ہی کسی مفسر کے ذہن میں آسکے ہیں۔ مفسرین قرآن نے اس آیت سے جو کچھ مراد لیا ہے وہ ہم بیان کر دیتے ہیں تاکہ قارئین اندازہ کرسکیں کہ مودودی صاحب نے قرآن مجید کے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

"اور اگر وہ توڑ دیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد اور عیب لگائیں تمہارے دین میں تو لڑو کفر کے سرداروں سے۔"

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یعنی اگر عہد و پیمان توڑ ڈالا (جیسے بنی بکر نے خلاف عہد خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے حملہ آوروں کی مدد کی) اور کفر سے باز نہ آئے بلکہ دین حق کے متعلق طعنہ زنی اور گستاخانہ عیب جوئی کرتے رہے تو سمجھ لو کہ اس طرح کے لوگ ائمۃ الکفر (کفر کے سردار اور امام) ہیں۔ کیونکہ ان کی حرکات دیکھ کر اور باتیں سن کر بہت سے کچرد اور بے وقوف پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ایسے سرغنوں سے پورا مقابلہ کرو۔ کیونکہ ان کا کوئی قول و قسم اور عہد و پیمان باقی نہ رہا۔ ممکن ہے تمہارے ہاتھوں سے کچھ سزا پا کر اپنی شرارت و سرکشی سے باز آ جائیں۔"

یاد رہے کہ اس آیت میں قسمیں توڑنے کا ذکر ہے۔ اسلام لانے کے لئے قسمیں نہیں اٹھائی جاتی تھیں کہ ان کو توڑے جانے کا سوال پیدا ہوتا۔

حضرت مولانا عبد القادرؒ اس کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں۔

(توڑ ڈالیں قسموں کو) اگر ثابت ہو کہ ایک کافر عیب دیتا ہے ہمارے دین کو وہ ذمی نہ رہا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے جو معنی بتائے ہیں وہ مودودی صاحب کے مفہوم کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔

قال ابن عباسؓ حرمت ھذہ الایۃ دماء اھل القبلۃ (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۳۴)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت نے ایک ہی قبلہ کی جانب منہ کرنے والوں (یعنی مسلمانوں) کا خون حرام کر دیا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جا سکتی اور مفسرین ہیں کہ یک زبان اسے سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی فرما رہے ہیں۔ علامہ رازی فرماتے ہیں۔

واکثر المفسرین حملہ علی نقض العھد قال ابن عباس والسدی والکلبی نزلت فی کفار مکۃ نکثوا ایمانھم بعد عھد الحدیبیۃ واعانوا بنی بکر علی خزاعۃ وھذہ الایۃ تدل علی ان قتال الناکثین اولی من قتال

غیرھم من الکفار لیکون ذلک زجراً لغیرھم۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۰۲)

(ترجمہ) تمام مفسرین نے اس سے نقضِ عہد مراد لیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سدیؒ اور کلبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ آیت ان کفار مکہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے حدیبیہ کے عہد کو توڑ ڈالا۔ اور قبیلہ خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عام کفار کی نسبت عہد توڑنے والے کفار سے جنگ کرنا زیادہ ضروری ہے تاکہ یہ دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔

علامہ بیضاوی بھی عہد سے مراد مشرکین کا عہد لیتے ہیں۔

التی حلفوھا مع الرسول علیہ السلام والمومنین ان لا یعاودوا علیہم تعاونوا بنی بکر علی خزاعۃ۔ (تفسیر بیضاوی جلد ۲ صفحہ ۲۰۸)

صاحب التفسیر المظہری نے بھی اس سے کفار مکہ کا عہد لیا ہے۔

(وان نکثوا ایمانھم) ای نقضوا عھدھم۔ (ائمۃ الکفر) قال ابن عباس نزلت فی ابی سفیان بن حرب والحارث بن ھشام وسھیل بن عمرو، وعکرمۃ بن ابی جھل وسائر روساء قریش یو مئذ الذین نقضوا العھد۔ (تفسیر المظہری جلد ۴ صفحہ ۱۴۳)۔

اگر وہ اپنی قسموں کو توڑ دیں یعنی اپنے عہدوں کی پرواہ نہ کریں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ائمۃ الکفر سے اس وقت کے روسا قریش مراد ہیں۔ یعنی ابو سفیان بن حرب، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابوجہل وغیرہ جنہوں نے عہد توڑا۔

غرضیکہ تمام مفسرین اس سے مراد کفار مکہ کا عہد مراد لیتے ہیں۔ مودودی صاحب کے خیال کے مطابق اگر مفسرین غلطی پر ہیں تو انہیں اس کے دلائل دینے چاہئیں تھے۔ اگر سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو اس آیت سے ذرا پہلے اس عہد کا ذکر گزر چکا ہے۔ کیف یکون للمشرکین عھدٌ عند اللہ و عند رسولہ الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم۔ یعنی مشرکین کے لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلعم کے نزدیک ان کا کوئی عہد قابلِ اعتنا ہو۔ سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد الحرام کے پاس معاہدہ کیا۔ پس جب تک وہ تمہارے ساتھ معاہدہ پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ معاہدہ پر قائم رہو۔

بالفرض اگر کچھ وقت کے لئے مودودی صاحب کا غلط استدلال مان بھی لیا جائے تو پھر بھی اس آیت سے یہ تو کسی صورت میں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ مجرد مذہب چھوڑنے سے کوئی شخص واجب القتل

ہو جاتا ہے، یہاں بھی اس سے لڑائی کرنے کے لئے وطعنوا فی دینکم کی قید موجود ہے۔ یعنی جب وہ تمہارے دین میں طعن کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت کے معنی میں اتنی کھینچ تان کے باوجود مودودی صاحب بھی اس استدلال سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ چنانچہ انہیں یہ کہنا پڑا کہ:۔

> بعض لوگ حدیث اور فقہ کی باتیں سنکر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لئے اگرچہ ہم نے اس بحث کے ابتدا میں قرآن کا حکم بھی بیان کر دیا ہے لیکن اگر بالفرض یہ حکم قرآن میں نہ بھی ہوتا تو حدیث کی کثیر التعداد روایات، خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں اور فقہا کی متفقہ رائیں اس حکم کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ ثبوت حکم کے لئے ان چیزوں کو ناکافی سمجھ کر جو لوگ اس کا حوالہ قرآن سے مانگتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تمہاری رائے میں کیا اسلام کا پورا قانون تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۲۰)

یہ تو ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ احادیث اور ائمہ مجتہدین کی آراء کے ساتھ مودودی صاحب نے کیا سلوک کیا ہے۔ لیکن جب ایک حکم قرآن میں واضح طور پر ایک جگہ نہیں دس جگہ موجود ہو تو اس پر پردہ ڈالنا کہاں کی دیانت داری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قتل مرتد کے لئے انہیں قرآن مجید سے ثبوت ملنے میں مایوسی ہوئی ہے۔ لیکن علمی دیانتداری کا یہ تقاضا تھا کہ جن آیات میں مرتد کی بابت واضح احکام موجود ہیں، ان کو بیان تو کر دیتے۔ چاہے ان کی من مانی تاویل ہی کر دیتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ آیات اپنے معانی میں اتنی واضح تھیں کہ ان سے مودودی صاحب کے مسلک کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ نیز ان میں تاویلات کی گنجائش بھی بہت کم تھی۔

یہ آیات امام بخاریؒ نے قتل مرتد کے باب میں جمع کی ہیں اور ہم بھی وہیں سے نقل کرتے ہیں۔

(۱) کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم و شھدوا ان الرسول حق و جاءھم البینٰت واللہ لا یھدی القوم الظالمین اولائک جزاھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ اجمعین خالدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون۔ الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا فان اللہ غفور رحیم۔

(آل عمران ۸۶)

ترجمہ۔ خدا ایسے لوگوں کو کیونکر راہ دکھائے گا جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ اور اس بات کی

گواہی دے کر کہ بے شک رسول سچا ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آگئیں اور اللہ ظالمین کو راہ نہیں دکھاتا۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی۔ اور سب لوگوں کی۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ نہ ان کا عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور نیک کام کئے تو بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

(۲) ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ واولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون (البقرہ ۲۱۷)

اور جو تم میں سے اپنے دین سے مرتد ہوگیا (پھر گیا) اور اسی کفر کی حالت میں مرگیا تو دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے اعمال اکارت جائیں گے اور یہ لوگ دوزخ کے رہنے والے ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

(۳) ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتھم و اولئک ھم الضالون۔ (آل عمران ۹۰)

جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا (یعنی مرتد ہوگئے) پھر اپنے کفر میں بڑھتے گئے تو ان کی توبہ قبول نہ کی جائے گی اور وہ گمراہ ہیں۔

(۴) ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا۔ (النساء ۱۳۷)

جن لوگوں نے اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کیا۔ پھر ایمان لے آئے اور پھر دوبارہ مرتد ہوگئے تو باری تعالیٰ نہ تو انہیں بخشے گا اور نہ ہی ان کو راہ راست کی طرف ہدایت کرے گا۔

(۵) یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ۔ (المائدہ ۵۴)

اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے تو اللہ اس کے بدلے ایک ایسی قوم لے گا جس سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔

(۶) من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم ذلک بانھم استحبوا الحیوۃ الدنیا علی الاخرۃ وان اللہ لا یھدی القوم الکفرین۔

(النحل ۱۰۷)

جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے سوائے اس شخص کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان

سے مطمئن ہو۔ لیکن وہ شخص جو شرح صدر سے کفر قبول کرے ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے آخرت کی بجائے دنیا کی زندگی کو زیادہ محبوب رکھا۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

(۷) و من ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً۔ اور جو الٹے پاؤں (اسلام) سے پھر جائے گا تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کچھ نقصان نہ ہوگا۔

(۸) و من یتبدل الکفر بالایمان فقد ضل سواء السبیل۔ جو ایمان کے بدلے کفر اختیار کرے تو پس وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہوگیا۔ (البقرہ ۱۰۸)

ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جو اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان آیات میں بار بار دین اسلام سے پھرنے (ارتداد) کا ذکر آیا ہے۔ اگر اس کی کوئی شرعی حد ہوتی تو یہ اس کے بیان کا صحیح موقع تھا مگر باری تعالیٰ نے ایک جگہ بھی ایسی کوئی سزا بیان نہیں فرمائی اور مرتد کے لئے اگر کوئی سزا بیان فرمائی ہے تو وہی جو ایک کافر کی سزا ہے کہ آخرت میں اس کی نجات نہ ہوگی۔

منافقین اور ارتداد

منافقین کے مرتد ہونے کی گواہی قرآن مجید دیتا ہے۔

(۱) اتخذوا ایمانھم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ انھم ساء ما کانوا یعملون ذلک بانھم امنوا ثم کفروا فطبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون۔ (منافقون ۲)

ان (منافقین) نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر لوگوں کو راہ حق سے روکا۔ بے شک وہ بہت ہی برا کام کرتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے پہلے ایمان لا کر کفر اختیار کیا۔ پس ان کے دلوں پر مہر کردی گئی ہے اس لئے وہ حق کو سمجھتے ہی نہیں۔

(۲) لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم۔ (التوبۃ ۶۶)

معذرت نہ کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو۔

(۳) یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر وکفروا بعد اسلامھم

(التوبۃ ۷۴)

یہ لوگ اس بات پر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا اور اسلام لانے کے بعد کافر ہوگئے۔

قرآن مجید میں منافق کو واضح طور پر مرتد قرار دیا گیا ہے۔ منافقین کی یہ جماعت مسلمانوں کو ہر موقع پر زک پہنچانے کی بھی کوشش کرتی رہی۔ رسول مقبول صلعم ان کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ لیکن کسی پر شرعی حد قائم نہیں کی گئی۔ خود مودودی صاحب کے نزدیک منافق کے لئے اس دنیا میں کوئی سزا نہیں۔ چنانچہ ان کے مسلک کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ مرتد لوگ قتل سے بچنے کے لئے منافقت اختیار کریں۔ بلکہ وہ خود ان کو ایسا کرنے کی راہ دکھا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> اگر وہ ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر نہیں رہنا چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لئے کیوں نہیں پیش کرتا۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۵۰۔ ۵۱)

یعنی اگر وہ اپنے آپ کو سزائے موت کے لئے پیش نہیں کر سکتا تو بے شک وہ منافق بن کر رہے۔

مرتد کا حکم احادیث میں

قرآن مجید سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ صرف دین چھوڑنے پر اس دنیا میں کسی قسم کی شرعی حد لازم نہیں آتی، ہم احادیث کو لیتے ہیں۔ احادیث میں جہاں بھی مرتد کی سزا بیان ہوئی ہے تو وہ اس قید سے مقید ہے کہ وہ شخص حارب اللہ ورسولہ (اللہ اور رسول سے جنگ کرنے) کا مرتکب ہو۔ اگر وہ اس کا مرتکب نہیں تو اس پر کوئی سزا نہیں۔ ہم پہلے ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جن میں مرتد کے قتل کا حکم ہے۔

(۱) عن عائشہ ان رسول اللہ صلعم قال لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدی ثلث خصال۔ زان محصن یرجم او رجل قتل رجلا متعمدا فیقتل او رجل یخرج من الاسلام فیحارب اللہ عزوجل ورسولہ فیقتل او یصلب او ینفی من الارض۔ (رواہ النسائی بحوالہ نیل الاوطار جلد ۷، صفحہ ۷)۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تین صورتوں کے بغیر کسی مسلمان کا خون جائز نہیں۔ یہ کہ وہ شادی شدہ ہو اور زنا کرے اسے سنگسار کیا جائے[1] دوسرا قتل عمد اور تیسرا یہ کہ دین اسلام چھوڑ کر اللہ اور رسول سے جنگ کرے۔ ایسے شخص کو قتل کر دینا چاہیئے یا پھانسی پر لٹکایا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔

---

[1] زانی کو سنگسار کرنے کی سزا قرآن میں نہیں ہے۔ طلوع اسلام۔

(۲) عن عائشہ قالت قال رسول اللہ صلعم لا یحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ الا فی احدی الثلاث رجل زنی بعد احصان فانہ یرجم ورجل خرج محارباً للہ ورسولہ فانہ یقتل اویصلب او ینفی او یقتل نفساً فیقتل بھا۔

(سنن ابوداؤد۔ کتاب الحدود۔ باب الحکم فی من ارتد)

حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ کسی مسلمان کا خون تین صورتوں کے علاوہ حرام ہے۔ پہلی یہ کہ وہ شادی کے بعد زنا کرے۔ پس اس کو رجم کیا جائے دوسرے یہ کہ وہ اللہ اور رسول سے جنگ کرے۔ پس اس کو قتل کر دیا جائے۔ یا پھانسی پر لٹکایا جائے۔ یا ملک بدر کر دیا جائے۔ یا وہ قتل عمد کا مرتکب ہو۔

بخاری شریف میں بھی اسی مضمون کی دو روایات ہیں۔

(۳) عن ابی قلابۃ قال فواللہ ما قتل رسول اللہ صلعم احداً قط الا فی احدی ثلث خصال۔ رجلٌ قتل بجریرۃ نفسہ فقتل او رجلٌ زنی بعد احصان او رجلٌ حارب اللہ ورسولہٗ وارتد عن الاسلام۔ (باب القسامۃ)۔

(۴) دوسری روایت بھی ابو قلابہ سے مروی ہے اور وہ کتاب التفسیر باب انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہٗ میں موجود ہے۔

ان تمام احادیث میں یہ حکم واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ صرف اس مرتد کی سزا قتل ہے جو حارب اللہ ورسولہٗ (یعنی اللہ اور رسول کے خلاف جنگ) کا مرتکب ہوا ہے۔ جو حارب اللہ ورسولہٗ کا مرتکب نہیں ہوا تو اس پر کوئی شرعی حد قائم نہ ہو گی جس کی مثالیں حدیث کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ بھی رسول مقبول صلعم کے ایسے عمل کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں۔

عن جابر بن عبد اللہ قال ان اعرابیاً بایع رسول اللہ صلعم علی الاسلام فاصابہ وعکٌ فقال اقلنی بیعتی فابی۔ ثم جاءہٗ فقال اقلنی بیعتی فابی فخرج فقال رسول اللہ صلعم المدینۃ کالکیر تنفی خبثھا وینصع طیبھا۔ (کتاب الاحکام باب من بایع ثم استقال البیعۃ)

ایک دیہاتی عربی نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ اسلام پر بیعت کی۔ اسے بخار ہو گیا تو اس نے کہا میری بیعت واپس کر دو۔ آپ نے انکار کیا۔ پھر وہ اعرابی دوبارہ آیا اور کہا کہ میری بیعت واپس کر دو۔ آپ نے پھر انکار کیا لیکن وہ اعرابی نکل گیا۔ (مدینہ سے چلا گیا) تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مدینہ بھٹی کی طرح ہے جو میل کچیل کو نکال دیتی ہے اور خالص کو رہنے دیتی ہے۔ یہ اعرابی آپ کے سامنے

مرتد ہوتا ہے لیکن اس کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔

یہ احادیث اور واقعات چونکہ مودودی صاحب کے مسلک کے خلاف جاتی تھیں اس لئے وہ انہیں سامنے ہی نہیں لائے۔ اور کثیر التعداد احادیث میں سے صرف وہ احادیث چن چن کر بیان کیں جن میں کسی وجہ سے حارب اللہ ورسولہ کی قید کا ذکر نہ تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ احادیث بھی اسی قید (حارب اللہ ورسولہ) سے مقید ہیں۔ کیونکہ یہ قید صرف اسی صورت میں ہٹ سکتی ہے جب کہ رسول اللہ اس کی تصریح فرمادیں کہ قتل مرتد کے لئے حارب اللہ ورسولہ کی قید لازمی نہیں۔ چنانچہ قرآن اور احادیث میں اس اصول کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

پہلی مثال۔ آیت (واشھدوا ذوی عدلٍ منکم) میں گواہوں کے لئے عدالت کی شرط ہے۔ اس لئے اس کے بعد گواہی دینے کا جو حکم ہوگا اس میں یہ قید لازماً تسلیم کرنا پڑے گی جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے۔ واشھدوا شھیدین من رجالکم (اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو۔) اس آیت میں عدالت کی کوئی قید نہیں لیکن پہلے حکم کی وجہ سے یہ گواہی بھی عدالت کی شرط کے ساتھ مقید ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ اس آیت میں عدالت کی قید نہیں اس لئے ہم غیر عادل گواہ کی شہادت بھی قبول کرلیں گے۔ غیر عادل گواہ کی شہادت تب ہی قابلِ قبول ہوگی جب اس کا واضح حکم ہو۔ اسی اصول کے مطابق ارتداد کے متعلق بھی دوسری تمام احادیث میں حارب اللہ ورسولہ کی قید لازماً ماننی پڑے گی۔

اس قسم کی کئی مثالیں قرآن اور حدیث سے پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ بات بالکل واضح ہے کہ جب ایک جگہ ایک حکم کسی شرط سے مقید ہو، دوسرے موقع پر اس شرط کا کوئی ذکر نہ کیا گیا ہو، اسے بھی پہلی شرط سے مقید ماننا پڑے گا۔ مسئلہ ارتداد کی بھی یہی صورت ہے۔ کچھ احادیث میں جو (حارب اللہ ورسولہ) کی قید لگائی گئی ہے، دوسری احادیث میں بھی لازماً اس قید کو تسلیم کیا جائے گا۔ اس لئے مودودی صاحب نے جو کوشش فرماکر ایسی احادیث نکالی ہیں جن میں اس قید کا ذکر موجود نہیں تو وہاں بھی ہمیں لازماً یہ قید تسلیم کرنی ہوگی۔ مودودی صاحب اس اصول سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان احادیث کو بیان کرنے سے گریز کیا جن میں یہ قید موجود تھی۔

ائمۂ مجتہدین

ائمہ مجتہدین نے بھی مرتد کے حکم کے لئے اس قید کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ حنفی فقہ کے مشہور امام علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں۔ یجب فی القتل بالردۃ ان یکون لدفع شر حرابہ

لاجزاءً علی فعل الکفر لان جزاءہ اعظم من ذلک عند اللہ تعالیٰ فیختص بمن یتاتی منہ الحراب وھو رجل ولھذا نھی النبی صلعم عن قتل النساء وعللہ بانھا لم تکن تقاتل۔ (فتح القدیر جلد ۴ ص - ۳۸۹)

ترجمہ۔ مرتد کے قتل میں امر ضروری ہے کہ یہ اس کے جنگ کے شر کو دور کرنے کے لئے ہو۔ نہ کہ اس کے کفر اختیار کرنے کے لئے کیونکہ کفر کی سزا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے جو اس سے بڑی ہے۔ پس قتل کی سزا صرف اس کے لئے مخصوص ہے جس میں جنگ کی صلاحیت ہو۔ اور وہ مرد ہی ہیں اس لئے نبی اکرم صلعم نے عورتوں کے قتل سے منع فرمایا کیونکہ وہ جنگ نہیں کرتیں۔

آگے چل کر مودودی صاحب نے ائمہ مجتہدین کی بابت بھی یہی فرمایا ہے کہ وہ قتل مرتد کے مسئلہ پر متفق ہیں۔ حالانکہ اوپر والی تصریح سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ سزا کفر اختیار کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ محارب اللہ ورسولہ کے مرتکب ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور چونکہ عورت میں لڑائی کی صلاحیت نہیں اس لئے اگر وہ مرتد ہو جائے تو اس پر کوئی شرعی حد نہیں اور یہ ائمہ مجتہدین کا متفقہ فیصلہ ہے۔

واما المرتدۃ لاتقتل ۔ مرتد عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ (ہدایہ باب احکام المرتدین صفحہ ۵۲۲)

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ائمہ مجتہدین کے نزدیک مرتد کے قتل کا سبب اس کا محارب اللہ ورسولہ کا مرتکب ہونا ہے۔ صرف کفر اختیار کرنے کی یہ سزا نہیں۔ ورنہ مرتد عورت بھی قتل کی مستحق ہوتی۔ چونکہ اس مسلک کے بیان سے مودودی صاحب کا مسلک کمزور ہوتا تھا اس لئے انہوں نے اس پر تو پردہ ڈالا اور عامۃ الناس کو دھوکا دینے کے لئے دو ایسی احادیث بیان کر دیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتدہ بھی واجب القتل ہے۔ حالانکہ یہی احادیث مودودی صاحب کے مسلک پر کاری ضرب ہیں کیونکہ ان میں واضح طور پر یہ موجود ہے کہ وہ عورت محارب اللہ ورسولہ کی مرتکب ہوئی تھی۔

اب پہلے ان احادیث کو دیکھئے جن کو مودودی صاحب نے قتل مرتدہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

(۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:-

ان امرأۃ ارتدت یوم احد فامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تتاب فان تابت والا فقتلت۔

جنگ احد کے موقع پر (جب کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی) ایک عورت مرتد ہو گئی۔ اس پر نبی صلعم نے فرمایا کہ اس سے توبہ کرائی جائے اور اگر توبہ کرے تو بہتر ورنہ قتل کر دی جائے۔

(۸) حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے۔ ان امرأۃ ام رومان ارتدت فأمر النبی صلعم بان یعرض علیها الاسلام فان تابت والا قتلت۔ ایک عورت ام رومان (ام مروان) نامی مرتد ہوگئی تو نبی صلعم نے حکم دیا کہ اس کے سامنے پھر اسلام پیش کیا جائے پھر وہ توبہ کرے تو بہتر ورنہ قتل کر دی جائے۔

بیہقی کی دوسری روایت اس سلسلہ میں یہ ہے کہ فابت ان تسلم فقتلت۔ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ اسی بنا پر قتل کر دی گئی۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۱۲ - ۱۷)

ان احادیث میں جس عورت یعنی ام مروان کا ذکر ہے اس کے متعلق تفصیل سے لکھا ہوا ہے کہ وہ صرف اسلام سے مرتد نہیں ہوئی تھی بلکہ محارب اللہ و رسولہٗ (اللہ اور رسولؐ سے جنگ) کی بھی مرتکب ہوئی تھی۔ حنفی فقہ کے مشہور امام شمس الائمہ علامہ سرخسی فرماتے ہیں۔

بانّ امّ مروان کانت تقاتل وتحرض علی القتال وکانت مطاعۃ فیھم —

یعنی ام مروان جنگ کرتی تھی اور دوسرے لوگوں کو جنگ کے لئے اکسایا کرتی تھی اور وہ اپنی قوم کی لیڈر تھی۔

(المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۰)

ملاحظہ فرمایئے کہ خود مودودی صاحب کی بیان کردہ دو احادیث میں یہ قید واضح طور پر نکل آئی کہ قتل کی وجہ محارب اللہ و رسولہٗ کا ارتکاب تھا۔ لیکن مودودی صاحب اسے بالکل گول کر گئے۔

مودودی صاحب کی بقیہ چھ احادیث کی بھی یہی صورت ہے۔ یعنی وہ محارب اللہ و رسولہٗ کی قید سے مقید ہیں۔ تاہم ان میں سے دو احادیث کا نفس مضمون ذرا مختلف ہے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا تفصیلاً جواب دیا جائے۔ ان میں سے پہلی حدیث مَنْ بدّل دینہ فاقتلوہ[1] ہے۔

مودودی صاحب نے یہاں بھی اپنا مخصوص طریقہ استعمال کیا ہے اور پوری حدیث نقل کرنے کی بجائے حدیث کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔ ان کا خدشہ بجا تھا کہ اگر یہ حدیث مکمل نقل ہو جائے تو اس کا ضعف ظاہر ہو جائے گا۔ ہم اس حدیث کو نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار سے نقل کرتے ہیں۔

عن عکرمۃ قال اتی امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ بزنادقۃ فاحرقھم فبلغ ذلک ابن عباس فقال لو کنت انا لم احرقھم لنھی رسول اللہ صلعم قال لا تعذبوا بعذاب اللہ ولقتلتھم بقول رسول اللہ صلعم من بدّل دینہ فاقتلوہ۔

---

[1] جو شخص اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو۔

(ترجمہ) عکرمہ سے مروی ہے کہ امیرالمومنین حضرت علیؓ کے پاس کچھ زندیق لائے گئے تو آپ نے ان کو جلا دیا۔ جب یہ بات حضرت عباسؓ تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا اگر میں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیونکہ رسول اللہ صلعم نے منع فرمایا ہے ایسا عذاب نہ دو جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ بلکہ میں ان کو قتل کر دیتا۔ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو اپنا دین بدل دے تو اس کو قتل کر دو۔

مودودی صاحب جانتے تھے کہ اس حدیث کے راوی عکرمہ کے متعلق ائمہ میں سخت اختلاف ہے۔ قال القاسم هو كذاب۔ (مشکوٰۃ نور محمدی صـ۶۱۱) قاسم کہتے ہیں کہ وہ سخت جھوٹا ہے ابن مسیب بھی اسے کذاب کہتے ہیں۔ سلیمان بن معبد کی روایت کے مطابق تو اس کا جنازہ تک نہیں پڑھا گیا تھا۔ اس حدیث میں دوسری غلط بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو آگ میں زندہ جلا دیا تھا۔ نعوذ باللہ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو اتنا علم بھی نہ تھا کہ احراق اسلام میں ناجائز ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت حسینؓ نے اسے (عکرمہ کو) حضرت علیؓ پر افترا باندھنے کے جرم میں اپنے گھر کے دروازے پر باندھ کے رکھا تھا۔

دوسری حدیث عبد اللہ بن ابی سرح کے متعلق ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے

كان عبد الله بن ابي سرح يكتب لرسول الله صلى الله عليه وسلم فازله الشيطان فالحق بالكفار فامر به رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يقتل يوم الفتح فاستجار له عثمان ابن عفان فاجاره رسول الله۔

عبداللہ بن ابی سرح کسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب (سیکریٹری) تھا پھر شیطان نے اس کو پھسلا دیا اور وہ کفار سے جا ملا۔ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے مگر بعد میں حضرت عثمانؓ نے پناہ مانگی اور رسول اللہ نے اس کو پناہ دی۔

اس واقعہ کی تشریح حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت میں یوں ملتی ہے۔

لما كان يوم فتح مكة اختبا عبد الله ابن سعد بن ابي سرح عند عثمان بن عفان فجاء به حتى اوقفه على النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله بايع عبد الله فرفع راسه فنظر اليه ثلثا كل ذلك يابي فبايعه بعد ثلث ثم اقبل على اصحابه فقال اما فيكم رجل رشيد يقوم الى هذا حين رآني كففت يدي عن بيعته فيقتله فقالوا ما ندري يا رسول الله ما في نفسك الا اومات الينا بعينك قال انه لا ينبغي لنبي ان تكون له

خائنۃ الاعین ۔ (ابوداؤد)

جب مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن ابی سرح نے عثمانؓ بن عفان کے دامن میں پناہ لی عثمانؓ اس کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسولؐ اللہ عبداللہ کی بیعت قبول فرما لیجئے۔ حضورؐ نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔ اور چپ رہے۔ تین دفعہ یہی ہوا۔ اور آپ اس کی طرف بس دیکھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ آخر تین دفعہ کے بعد آپ نے اس کو بیعت میں لے لیا۔ پھر آپ اپنے صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تمہارے اندر کوئی ایسا بھلا آدمی موجود نہ تھا کہ جب اس نے دیکھا کہ میں نے بیعت سے ہاتھ روک رکھا ہے تو آگے بڑھتا اور اس شخص کو قتل کر دیتا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے آنکھوں سے اشارہ کیوں نہ فرما دیا اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ایک نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ آنکھوں کی چوری کرے۔

(مرتد کی سزا صفحہ ۱۵-۱۶)

حدیث میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ عبداللہ بن ابی سرح رسولؐ اللہ کا سکریٹری تھا اور گمراہ ہو کر دشمنانِ اسلام سے جا ملا تھا۔ کفار مکہ اس وقت رسول اکرم صلعم سے برسرِ جنگ تھے۔ اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ کسی بادشاہ کا سکریٹری اس کے برسرِ جنگ دشمن سے جا ملے۔ ظاہر ہے کہ دشمن سے مل کر وہ کیا کچھ نہ کرے گا۔ اس حیثیت سے تو وہ بدرجہ اولیٰ حارب اللہ و رسولہٗ کا مرتکب ہوا تھا۔ رسول اللہ صلعم اسے کسی صورت میں معاف نہیں کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے۔ حالانکہ توبہ کے بعد مرتد، مرتد نہیں رہتا۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عثمانؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ اس لئے حضرت عثمانؓ کی سفارش کو ٹال نہ سکتے تھے۔

ارتداد اور خلافت راشدہ کے نظائر

مودودی صاحب نے جس طرح احادیث سے اپنا غلط مسلک ثابت کرنے کے لئے (حارب اللہ ورسولہٗ) کے الفاظ حذف کر دیئے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے جو نظائر انہوں نے اپنے مسلک کے ثبوت میں پیش کئے ہیں ان میں بھی اسی اصول سے کام لیا ہے۔ یہاں تقریباً تمام نظائر میں یہ قید لفظاً موجود تھی لیکن آپ نے ان الفاظ کا ذکر تک نہیں کیا۔ ہم سب سے پہلے ان کی سب سے بڑی نظیر کو لیتے ہیں جس کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

مرتدوں کے خلاف خلیفۂ اوّل کا جہاد

مگر ان سب نظروں سے بڑھ کر وزنی نظر اہل ردہ کے خلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جہاد ہے۔ اس میں صحابہ کرام کی پوری جماعت شریک تھی۔ اس سے ابتدا میں کسی نے اختلاف کیا بھی تھا تو بعد میں وہ اختلاف اتفاق سے بدل گیا تھا۔ لہٰذا یہ معاملہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم پائی تھی ان سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ جو گروہ اسلام سے پھر جائے اس کے خلاف اسلامی حکومت کو جنگ کرنی چاہیئے۔ (مرتد کی سزا اسلامی قانون میں صفحہ ۲۳)

قارئین ذرا آگے چل کر دیکھیں گے کہ مودودی نے اپنے غلط مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے سلف صالحینؓ کے عمل کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے ہم مانعین زکوٰۃ کے خلاف خلیفۂ اول کے جہاد کو مستند تاریخی حوالوں سے کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے کہ ان کا جرم دین اسلام سے پھر جانا نہ تھا بلکہ وہ حارب اللہ و رسولہٗ کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے سے پہلے ہم بخاری شریف کے شارح عینیؒ حنفی کا نتیجۂ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ مانعین زکوٰۃ سے جہاد کی وجہ کیا تھی۔ فرماتے ہیں:۔

وانما قاتل الصدیق مانعی الزکوٰۃ لانھم امتنعوا بالسیف ونصبوا الحرب للامۃ

(عینی شرح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۳۶)

حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے اس لئے جہاد کیا کہ انہوں نے تلوار کے ذریعہ سے زکوٰۃ کو روکا۔ اور مسلمانوں کے لئے لڑائی کا بازار سرگرم کیا۔

یہ لوگ مختلف قبائل پر مشتمل تھے اور رسول اللہ صلعم کی وفات کے فوراً بعد وہ جس پہلے جرم کے مرتکب ہوئے اسے علامہ ابن خلدون کی زبانی سنئے۔

فرتب بنو ذبیان وعبس علی من فیھم من المسلمین وفعل ذلک غیرھم من المرتدین۔ (تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۶۶۔)

(ترجمہ) (رسول اللہ صلعم کی وفات کی خبر سنتے ہی) قبیلہ بنو ذبیان اور عبس نے اپنے اپنے قبیلوں کے بقیہ مسلمانوں (جنہوں نے ان کے ساتھ مرتد ہونے سے انکار کر دیا تھا) پر پل پڑے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے مرتدین نے بھی اپنے اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔

تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں مرتدین کے اس پہلے جرم کا ذکر موجود ہے کہ انہوں نے اپنے

اپنے قبیلے کے بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ مورخ طبری نے بھی تقریباً یہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔

فوثب بنو ذبیان وعبس علی من فیھم من المسلمین وقتلوھم کل قتلہ وفعل من وراءھم فعلھم۔ (تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۸۷۷)

ان ظالموں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کی نعشوں کے ساتھ مثلہ کیا۔ یعنی ان کے ناک کان وغیرہ کاٹ ڈالے۔ اور ان کو آگ میں جلایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان مرتدین کو شکست ہوئی تو حضرت خالدؓ بن ولید نے انہیں اس وقت تک معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک کہ وہ ان مجرموں کو پیش نہ کر دیں۔ جنہوں نے بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ تاریخ کی تمام کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔

ولم یقبل خالد (بعد ھزیمتھم) من احد من اسد وغطفان ولا ھوازن ولا سلیم ولا طیئ الا ان یاتوہ بالذین حرقوا ومثلوا وعدوا علی اھل الاسلام فی حال ردتھم۔ (تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۹۰۰)

(ترجمہ) جب قبائل اسد، غطفان، ہوازن، سلیم اور طیئ کو شکست ہوگئی تو حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کو معافی دینے سے انکار کر دیا۔ جب تک کہ وہ ان لوگوں کو پیش نہ کریں جنہوں نے مرتد ہونے کے بعد مسلمانوں کو آگ میں جلایا ان کا مثلہ کیا۔ اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔

بے گناہ مسلمانوں کا قتل کرنا تو ان مانعینِ زکوٰۃ کا پہلا جرم تھا۔ ان کا دوسرا جرم مدینہ شریف پر چڑھائی تھی۔ ان کے وفود جب نماز اور زکوٰۃ سے معافی لینے آئے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو تقریر فرمائی اس سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگ جاتے ہوئے اعلانِ جنگ کر گئے۔ اس تقریر کا کچھ حصہ یہ ہے۔

انّ الارض کافرۃٌ وقد رأیٰ وفدھم منکمُ قلّۃً وانکم لا تدرون الیلاً تؤتون ام نھاراً وادناھم منکم علی برید وکان القوم یأملون ان نقبلَ منھم ونوادعھم وقد ابینا علیھم ونبذنا الیھم عھدھم فاستعدوا۔ (طبری ج ۴ ص ۱۸۷۵)۔

(ترجمہ) معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام ملک اب کافر ہوگیا ہے۔ اور ان کے وفد نے تمہاری قلت کا اندازہ کر لیا ہے۔ اس لئے اس بات کا ہر وقت خدشہ ہے کہ وہ رات کو یا دن کو حملہ کر دیں۔ ان کا قریبی لشکر ہم سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے۔ رفقاء ان کے مطالبات مان لینے پر مائل تھے کہ ان سے معاہدہ کر لیں لیکن ہم نے انکار کر دیا اور ان کا عہد ان کو لوٹا دیا پس تم ان کے حملے کا جواب دینے کے لئے کمربستہ ہو جاؤ۔

چنانچہ وہی کچھ ہوا جس کا حضرت ابوبکرؓ کو خدشہ تھا۔

فما لبثوا الا ثلاثاً حتی طرقوا المدینۃ غارۃ مع اللیل۔ (ایضاً)

پس تین ہی دن گزرے تھے کہ انہوں نے رات کے وقت مدینہ پر چھاپہ مارا۔ ان حملہ کرنے والوں میں تقریباً تمام کے تمام مرتد قبائل شامل تھے۔ مثلاً بنوکنانہ۔ بنواسد۔ فزارہ۔ غطفان۔ ثعلبہ وغیرہم۔ اگرچہ حملہ کرنے میں پہل عبس و ذبیان نے کی۔

وکان اول من صادمہم عبس وذبیان عاجلوہ فقاتلہم قبل رجوع اسامۃ۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۶۲)

امید ہے کہ خلافت راشدہ کی سب سے بڑی نظیر پیش کرکے خونِ ناحق کا جواز ثابت کرنے والوں پر اب اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا کہ ان مرتدین کے کیا کیا جرم تھے۔ وہ مسلمانوں اور اسلام کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے خلیفہ اول نے ان سے جہاد کیا۔

مسیلمہ کذاب کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ وہ دورِ رسالت میں ہی مرتد ہو گیا لیکن حضورؐ نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ لیکن جب بعد میں یہی مسیلمہ اسلام کے لئے ایک خطرہ بن گیا تو اس پر چڑھائی کرکے اس فتنہ کو فرو کر دیا گیا۔

خلافتِ راشدہ کے دوسرے نظائر

اس سب سے بڑی نظیر کے علاوہ مودودی صاحب نے کچھ چھوٹے چھوٹے نظائر بھی پیش کئے ہیں جیسا کہ ہم احادیث کی بحث اور سب سے بڑی نظیر کے جواب میں ثابت کر چکے ہیں کہ ان لوگوں کا اصل جرم "محاربِ اللہ ورسولہٗ" کا ارتکاب تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے نظائر میں بھی ان لوگوں کا اصل جرم یہی تھا کہ وہ محاربِ اللہ ورسولہٗ (یعنی اللہ اور رسول سے جنگ) کے مرتکب ہوئے تھے۔ بعض نظائر میں تو اس قید کا واضح طور پر ذکر تھا لیکن مودودی صاحب نے اپنی عام روش کے مطابق اس قید کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان میں سے چند نظائر کا جواب دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مودودی صاحب کے نزدیک سب سے بڑی نظیر (جس کا جواب اوپر گزر چکا ہے) کے بعد سب سے اہم نظیر یہ ہے۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایک عورت جس کا نام ام قرفہ تھا اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا مگر اس نے توبہ نہ کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے قتل کر دیا۔ (دار قطنی بیہقی) (مرتد کی سزا صفحہ ۱۷)

شمس الائمہ علامہ سرخسی اس عورت کے متعلق فرماتے ہیں :-

وام قرفۃ کان لہا ثلثون ابناً کانت تحرضہم علی قتال المسلمین و فی قتلہا کسر شوکتہم ۔ (المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۰)

ام قرفہ کے تیس لڑکے تھے جنہیں وہ مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرنے کے لئے اُبھارتی رہتی تھی اور اس کے قتل سے اس کے لڑکوں کا زور ٹوٹتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قتل کی وجہ وہی جرم تھا۔ یعنی محاربِ اللہ و رسولہٗ کا ارتکاب۔

دوسری نظیر۔ حضرت عمرو بن عاصؓ حاکم مصر نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ ایک شخص اسلام لایا تھا پھر کافر ہوگیا۔ پھر اسلام لایا پھر کافر ہوگیا۔ یہ فعل وہ کئی مرتبہ کرچکا ہے اب اس کا اسلام قبول کیا جائے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جب تک اللہ اس سے اسلام قبول کرتا ہے تم بھی کئے جاؤ۔ اس کے سامنے اسلام پیش کرو۔ مان لے تو چھوڑ دو ورنہ گردن ماردو۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۱۸)

کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ اس فرمانِ خداوندی کے خلاف فیصلہ دیتے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَلَا لِیَہْدِیَہُمْ سَبِیْلًا ؕ (النساء [illegible])

ترجمہ۔ وہ لوگ جو ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کفر کیا اور پھر ایمان لائے اور پھر دوبارہ کفر اختیار کیا اور پھر کفر میں بڑھتے گئے تو اللہ تعالیٰ نہ ہی ان کی مغفرت کرے گا نہ ہی ان کو راہ راست دکھائے گا۔

تیسری نظیر سعدؓ بن ابی وقاص اور ابوموسیٰ اشعری نے تستر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس ایک قاصد بھیجا۔ قاصد نے حضرت عمرؓ کے سامنے حالات کی رپورٹ پیش کی۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے پوچھا کوئی اور غیر معمولی بات۔ اس نے عرض کیا ہاں! اے امیرالمومنین! ہم نے ایک عرب کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہوگیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا پھر تم نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ اس نے کہا ہم نے اسے قتل کردیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ اسے ایک کمرے میں بند کرکے دروازہ کا تیغہ لگا دیتے۔ پھر تین دن تک روزانہ ایک روٹی اس کے پاس پھینکتے رہتے شاید کہ وہ اس دوران توبہ کرلیتا۔ خدایا یہ کام میرے حکم سے نہیں ہوا نہ میرے سامنے ہوا نہ میں اسے سُن کر راضی ہوا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر حضرت سعد اور ابوموسیٰ اشعری سے کوئی بازپرس نہیں کی اور نہ کوئی سزا تجویز کی۔

(مرتد کی سزا صفحہ ۱۸)

جیسا کہ عبارت بالا سے واضح ہو رہا ہے یہ جنگ کا حادثہ تھا اور حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے کہ اسے کمرے میں بند کرکے دروازہ کا تیغہ لگا دیتے (یعنی قید کرلیتے) سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ وہ دشمن

کا جاسوس تھا۔ عام مرتد کے لئے تو یہ شرط نہیں کہ اس سے توبہ کرانے کے لئے اسے قید میں رکھا جائے حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اس ڈر سے کہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے اس کا جلدی سے خاتمہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی اس لئے آپ نے اپنی برأت کا اظہار فرمایا۔ حضرت عمرؓ کا ان کو سزا نہ دینے سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ ہر دین بدلنے والے کا سر قلم کر دیا جائے۔ کیا اجتہادی غلطی پر بھی کسی کو سزا دی جا سکتی ہے؟ بعض کے نزدیک تو یہ روایت ہی سرے سے مشکوک ہے زعموا ان ھذا الاثر عن عمر لیس بمتصل ——— (نیل الاوطار ج ۷، ص ۲۰۲)

چوتھی نظیر — حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کو اطلاع ملی کہ بنی حنیفہ کی ایک مسجد میں کچھ لوگ شہادت دے رہے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ پس حضرت عبد اللہ نے پولیس بھیج کر ان کو گرفتار کر کے بلا لیا۔ جب وہ لوگ ان کے سامنے پیش ہوئے تو سب نے توبہ کر لی اور اقرار کیا کہ ہم آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ حضرت عبد اللہ نے اوروں کو تو چھوڑ دیا مگر ان میں سے ایک شخص عبد اللہ ابن النواحہ کو موت کی سزا دی۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ نے ایک ہی مقدمہ میں دو مختلف فیصلے کئے۔ حضرت عبد اللہ نے جواب دیا کہ یہ ابن النواحہ وہ شخص ہے جو مسیلمہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفیر بن کر آیا تھا۔ میں اس وقت حاضر تھا۔ ایک دوسرا شخص حجر بن وثال بھی اس کے ساتھ سفارت میں شریک تھا۔ آنحضرتؐ نے ان دونوں سے پوچھا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ ان دونوں نے جواب دیا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اگر سفارتی وفد کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت عبد اللہ نے کہا کہ میں نے اسی وجہ سے ابن النواحہ کو سزائے موت دی ہے۔ (طحاوی)

(مرتد کی سزا صفحہ ۱۹)

مرتد کے متعلق یہ حکم ہے کہ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ مرتد نہیں رہتا۔ یہاں سب لوگوں نے توبہ کر لی اس لئے وہ ارتداد کے دائرہ سے نکل کر اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ———

— ائمہ مجتہدین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مرتد ہونے کا انکار کرے تو صرف یہی چیز اس کی توبہ تصور کی جائیگی۔

اِذا جحد المرتد الردۃ واقر بالتوحید وبمعرفۃ رسول اللہ و دین الاسلام فہذا منہ توبۃ۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ صفحہ ۹۰)

(ترجمہ) اگر کوئی شخص اپنے مرتد ہونے سے انکاری ہو اور توحید، رسالت اور دین اسلام کا اقرار

کرے تو یہ اس کی توبہ ہے۔

تو حضرت عبداللہ بن مسعود نے ابن النواحہ کو ارتداد کے جرم میں قتل نہ کیا تھا کیونکہ وہ اس سے تو وہ تائب ہو چکا تھا۔ بلکہ دوسرے جرم کی وجہ سے۔ دراصل جیسا کہ ہم سب سے بڑی نظیر کے تجزیہ کے وقت بتا چکے ہیں مسیلمہ کذاب کا قبیلہ باغی قبیلہ تھا۔ ان لوگوں کو اگر کوئی سزا دی جاتی تھی تو اس لئے کہ وہ باغی تھے۔ اور محارب اللہ ورسولہ کے مرتکب ہوئے تھے۔ ابن النواحہ بھی اس قبیلہ کے سرکردہ آدمیوں سے تھا۔

پانچویں مثال بھی مسیلمہ کے ساتھیوں کی ہے۔ ان کے قتل کرنے یا نہ کرنے کی اصل وجہ ان کا جرم بغاوت تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔

ائمہ مجتہدین اور قتل مرتد

ائمہ مجتہدین کا مسلک نقل کرتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ مسئلہ کی جزئیات میں مذاہب اربعہ کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو بہرحال بجائے خود یہ مسئلہ کہ مرتد کی سزا قتل ہے فقہ کے چاروں مذاہب میں متفق علیہ ہے۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۴۶)

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کے نزدیک مرتد کا قتل محارب اللہ و رسولہ کی قید سے مقید ہے۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:-

یجب فی القتل بالردۃ ان یکون لدفع شر حرابہ لا جزاءً علی فعل الکفر لان جزاءہ اعظم من ذلک عند اللہ تعالیٰ فیختص بمن یاتی عنہ الحراب و ھو الرجل و لھذا نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل النساء و علّلہ بانھا لم تقاتل۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ۴ صفحہ ۳۸۹)

مرتد کو اس کے کفر اختیار کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے جنگ کے شر کو رفع کرنے کے لئے قتل کیا جائے گا کیونکہ محض کفر کی سزا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوگی جو اس سے زیادہ ہے اس لئے قتل کا حکم صرف اسی سے مخصوص ہے جس میں جنگی قابلیت ہو اور وہ مرد ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے قتل سے منع فرمادیا اور اس کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ وہ جنگ نہیں کرتیں۔

حنفی فقہ کی سب سے معتبر کتاب ہدایہ میں مرتد کے قتل کے متعلق یہ تفصیلات ملتی ہیں۔

وکذا قولہٗ علیہ السلام من بدّل دینہٗ فاقتلوہٗ ولانہٗ کافرٌ حربیٌ"۔ (ہدایہ اولین باب احکام المرتدین صفحہ ۵۶۶)

"اور اسی طرح وہ فرمانِ نبویؐ کہ جو اپنا دین بدل لے اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ وہ جنگ کرنے والا کافر ہے"۔

اس کی مزید تفصیل وہاں ملتی ہے جہاں صاحبِ ہدایہ مرتدہ عورت کو قتل نہ کرنے کے اسباب بیان فرماتے ہیں۔

ان النبی علیہ السلام نھی عن قتل النساء ولان الاصل تاخیر الاجزیۃ الی دارالاخرۃ اذ تعجیلھا یخل بمعنی الابتلاء وانما عدل عنہ لدفع شرٍ ناجزٍ وھو الحراب ولا یتوجہ ذلک من النساء لعدم صلاحیۃ البنیۃ بخلاف الرجال۔ (ایضاً)۔

ترجمہ:۔ یہ کہ نبی صلعم نے عورتوں کے قتل سے منع فرمایا اور شرعی سزا کا اصول یہ ہے کہ اس کو قیامت کے دن کے لئے مؤخر کر دیا جائے۔ کیونکہ دنیا میں اس کی سزا دینا ایک حیثیت سے ابتلاء کی حقیقت کو توڑنا ہے۔ تاہم بعض دفعہ اس اصول کے خلاف دنیا میں سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ پیدا ہونے والی بُرائی کو روکنے کے لئے ہو جو اس صورت میں جنگ اور لڑائی ہے۔ چونکہ عورتوں میں پیدائشی طور پر مردوں کی طرح جنگی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ ہم احادیث اور نظائر کی بحث میں اس امر پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں کہیں تو حارب اللہ اور رسولہٗ کے الفاظ موجود ہیں اور کہیں ان الفاظ کو بیان نہیں کیا گیا۔ فقہ میں بھی یہی صورت ہے۔ لیکن ائمہ نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ یہ شرعی سزا صرف اسی پر نافذ ہو گی جو حارب اللہ و رسولہٗ کا مرتکب ہوا ہے اور عورت کو اس سزا سے مستثنیٰ کرنا اس کی بڑی دلیل ہے کہ اس میں حارب اللہ و رسولہٗ یعنی اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ہم المبسوط کے حوالے سے نقل کر آئے ہیں کہ جن ایک دو عورتوں کو قید کیا گیا تھا وہ واضح طور پر حارب اللہ و رسولہٗ کی مرتکب ہوئی تھیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں بھی یہ قید موجود ہے:۔

وقوم ارتدوا عن الاسلام وحاربوا المسلمین وغلبوا علی مدینۃ من مدائنھم فی ارض الحرب ومعھم نساءھم وذراریھم ثم ظھر المسلمون علیھم فانہ یقتل رجالھم ونسبی نساءھم وذراریھم۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۲ صفحہ ۹۰)

اگر مسلمانوں کی ایک جماعت اسلام سے مرتد ہو جائے اور مسلمانوں سے جنگ کر کے کسی علاقہ میں ان کے شہر پر غالب آجائے۔ اور ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی ہوں اور پھر مسلمان ان پر غالب آجائیں تو ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور بیوی بچوں کو غلام بنالیا جائے۔[1]

یہاں بھی ارتداد کی مرتکب عورتیں بھی ہیں لیکن انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ دراصل قرآن، احادیث، خلفائے راشدین کے نظائر اور فقہ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ایسا مرتد واجب القتل ہے۔۔ جو حارب اللہ ورسولہ (اللہ اور رسول سے جنگ کرنے) کا مرتکب ہو۔ اور یہ وہ سزا ہے جو مسلمانوں سے جنگ کرنے والے ہر شخص کے لئے ہے۔ چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو تو اس ساری بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صرف دین بدلنے پر کوئی شرعی حد لاگو نہیں ہوگی۔

اس وقت بعض لوگوں کو شاید اس مسئلہ کی سنگینی کا اچھی طرح احساس نہ ہو لیکن جس قسم کے اسلامی نظام کا مطالبہ مودودی صاحب کرتے ہیں اس میں یہ سب کچھ ہو گا۔ اس میں اپنے مخالف کو ختم کرنے کے لئے یہ سب سے بڑا ہتھیار ہو گا۔ جس کو چاہا اس پر مرتد کا فتویٰ لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

"اسلامی نظام" کے قیام کے بعد مودودی صاحب مسلمانوں سے کس طرح نپٹیں گے یہ خود ان کی زبانی سنئے۔

"میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ (واللہ الموفق للصواب) کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً وعملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے اجتماعی نظام سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے۔ اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۹۴)

[1] غلام بنالینا قرآن کی رو سے جائز نہیں۔ طلوع اسلام۔

یعنی جب یہ حضرات برسرِ اقتدار آئیں گے تو جو لوگ ان کے پیش کردہ اسلام سے متفق نہ ہوں گے انہیں ایک سال کا نوٹس دے کر قتل کر دیا جائے گا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب یہ لوگ قتل ناحق جیسے سنگین جرم کے لئے قرآن، حدیث، خلفائے راشدین اور ائمہ مجتہدین کو غلط طور پر استعمال کر سکتے ہیں تو جب ان کے ہاتھ میں اقتدار آ جائے گا تو دوسرے معاملات میں یہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے۔ خدا اس سیلے ہماری امت پر رحم کرے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے

میزان پبلیکیشنز کی شائع کردہ اِدارہ کی کتاب

قتلِ مُرتد (اور) غلام اور لونڈیاں

ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں قتلِ مرتد کے متعلق مبسوط بحث کے علاوہ مودودی صاحب کے اس مسلک کی بھی تردید کی گئی ہے کہ اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ بڑی بصیرت افروز اور معلومات افزا کتاب ہے۔

قیمت (ایک روپیہ ۵۰ پیسے) صرف

یہ کتاب ادارہ طلوعِ اسلام بی-۲۵ گلبرگ لاہور سے بھی مل سکتی ہے۔

پٹسن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ

ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے۔ بوریاں۔ سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیا وکینواس دُنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں اور دُنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

منیجنگ ایجنٹس

احمد برادرز لمیٹڈ ۳۵-۳۶ جناح ایونیو۔ رمنا۔ ڈھاکہ (۲)

تار کا پتہ ـــــ باوانی ـــــ فون نمبر ۲ ـــ ۶۷۳۱

کراچی آفس ـــ بینک ہاؤس حبیب اسکوائر۔ بندر روڈ کراچی

بابُ المراسلات

۱۔ صحابۂ کبارؓ اور احادیث

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا مجموعۂ احادیث جلا دیا تھا اور حضرت عمرؓ نے احادیث مرتب کرنے سے منع کر دیا تھا۔ براہ کرم ان امور کی تفصیل سے بذریعہ طلوع اسلام مطلع فرمائیں اور حوالہ بھی درج کر دیں۔

طلوع اسلام

امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ

میرے والد (حضرت ابو بکرؓ) نے رسول اللہؐ کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔

اس کے بعد فرمایا۔

پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت صدیق اکبرؓ) بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا، کیا آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپ بے چین ہو رہے ہیں)۔ (آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا) جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹی! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگوائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔ (تذکرۃ الحفاظ۔ امام ذہبی)۔

ہم نے اس روایت کو مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی کتاب "تدوینِ حدیث" سے نقل کیا ہے۔ یہ اس کتاب کے صفحات ۲۸۵-۲۸۸ پر ہے۔

اسی کتاب میں مسند امام احمدؒ کے حوالے سے حسب ذیل روایت بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے بہت پہلے صحابۂ کبارؓ نے نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق، (حضورؐ کے سامنے،

اپنی احادیث کے مجموعوں کو جلا دیا تھا۔ روایت یہ ہے۔

ہم لوگ جو کچھ رسول اللہ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ تب ایک دن رسول اللہ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب ؟ (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیئے) پھر فرمایا (ستھری کرو، خالص رکھو) اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو۔ (صحابی کہتے ہیں) کہ تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔ (مجمع الزوائد)

(تدوین حدیث صـ۴۲۹)

امام ذہبی نے حضرت ابو بکرؓ صدیق کے متعلق حسب ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ پس چاہیئے کہ رسول اللہ کی طرف منسوب کرکے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔ پھر تم سے اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ پس چاہیئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو۔ اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی — بحوالہ تدوین حدیث صـ۴۲۱)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے۔ علامہ ابن عبد البر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

" عمرؓ بن خطاب نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوں نے رسول اللہ کے صحابیوںؓ سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوائی جائیں۔ لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ سا مہینہ ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالےٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور

ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۹۴)

اور یہ اس لئے تھا کہ خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔ (صحیح مسلم)

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ حدیث کو جمع اور مدون نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے چنانچہ طبقات میں ہے کہ

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہو گئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔ حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دئے تب آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔

(طبقات۔ جلد ۵۔ صفحہ ۱۴۱) (تدوین حدیث صفحہ ۲۹۹)

یعنی حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ خود نبی اکرمؐ نے اپنے صحابیوںؓ سے لے کر اسے جلایا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر، ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذر آتش کر دیا۔

یہ کچھ دار الخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کے متعلق حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

عمرؓ بن خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلم بند کر لیا جائے مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا۔ تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو چاہیئے کہ اسے محو کر دے۔ یعنی ضائع کر دے۔ (جامع بیان العلم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۶۵) تدوین حدیث صفحہ ۳۹۴)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے "قرن اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعت حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امر اتفاقی نہیں بلکہ مبنی بر مصلحت ہے" انہوں نے، اس سے پہلے امام ابن حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے شام تک شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۱۴)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ و دانستہ ایسا نہیں کیا تھا اور اس کی وجہ وہ ہے جسے مولانا سید انور شاہ (مرحوم) نے اپنے درس بخاری کی املائی تقریر میں ان الفاظ میں بیان فرمائی تھی۔ یعنی

نبی صلعم کے زمانہ میں ہی اگر حدیثیں جمع ہو جاتیں تو گو بظاہر یہ زیادہ اچھی بات نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت مقصد ہی یہ تھا کہ حدیثوں کی تدوین اس طریقے سے نہ ہو جیسے قرآن کی تدوین پر غیر معمولی توجہ صرف کی گئی اور قرآن کی حفاظت میں جو دلچسپی لی گئی، یہ کیفیت حدیث کی تدوین میں پیدا نہ کی جائے تاکہ (حدیث) قطعی اور یقینی ہو سکنے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے اور نہ اس کے ساتھ وہ سرگرمی دکھائی جائے (جو قرآن کی تدوین میں دکھائی گئی) بلکہ قصداً اور ارادۃً حدیثوں کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا (کہ قرآن کے مقابلہ میں) اس کا درجہ دوسرا ہو گیا۔ ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد اور تحقیق و تدقیق کی، فقہا کی فکر و نظر اور محدثین کی تلاش و جستجو کی گنجائش ان میں پیدا ہو گئی۔

اور یہ اس لئے

تاکہ مسلمانوں پر ان کا دین زیادہ کشادہ ہو۔ اور ہر طرح سے سہولتیں اس باب میں ان کو میسر آجائیں۔

سچ فرمایا گیا کہ الدین صرف سہولت اور آسانی ہے۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۳۶-۲۳۷)

یہی بات جب طلوع اسلام کہتا ہے تو اسے منکر حدیث قرار دے کر کافر اور گردن زدنی ٹھہرایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں مولانا گیلانی نے کہا ہے کہ

(خبر احاد تو ایک طرف) ایسی حدیثیں جو اپنے بیان کرنے والوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے تواتر کے درجہ تک تو نہ پہنچی ہوں لیکن پھر بھی اگلی نسلوں تک انہیں عام شہرت حاصل رہی ہے۔ اصطلاحاً جس کا نام حنفیوں نے خبر مشہور کر رکھا ہے۔

ان تک کے متعلق شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ

اس قسم کے مشہور حدیثوں کے منکر کو کافر نہیں ٹھہرایا جا سکتا یعنی اس پر کفر کا فتویٰ اور یہ کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا۔ یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۰۹)

اس کے بعد مولانا گیلانی (مرحوم) لکھتے ہیں،

اور جب ان کا حال یہ ہے تو درجہ میں ان سے جو حدیثیں فروتر ہیں یعنی خبر احاد خبریں، ظاہر ہے کہ ان کے ماننے نہ ماننے پر مسلمان ہونے نہ ہونے کا مدار کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے جو راہ نمائیاں میسر آتی ہیں، خواہ بجائے خود وہ کتنی بھی قیمتی ہوں لیکن باایں ہمہ یہ مسلمہ ہے کہ

ان کے چھوڑنے پر چھوڑنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ (جو احکام احاد خبروں سے پیدا ہوتے ہیں) وہ نہ فرض ہوتے ہیں نہ واجب۔ (کشف۔ جلد ۱ صفحہ ۲۱۰)

اور یہ حکم تو ان کا ہے جو ان حدیثوں کو مانتے ہیں لیکن ان پر عمل کی توفیق سے محروم ہیں۔ باقی مسلمانوں میں ایک گروہ مثلاً معتزلہ وغیرہ جو یہ سمجھتے تھے کہ ایسی حدیثوں کا کیا اعتبار جن کی خبر معدودے چند آدمیوں نے دی ہو۔ یعنی سرے سے خبر احاد کی احادیث کے جو منکر ہیں ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ صاحب کشف نے نقل کیا ہے کہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۱۱-۲۰۹)

بہرحال یہ ہے کیفیت صحابہ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی۔ یعنی

(۱) رسول اللہ نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔

(۲) صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور پر لکھی تھیں، حضورؐ نے انہیں لے کر جلوا دیا۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدون کردہ مجموعۂ احادیث کو جلا دیا، اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔

(۴) حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدون نہیں کرنی چاہئیں۔

(۵) حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔

(۶) اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوئی ہوں تو وہ انہیں ضائع کر دے۔ اور

(۷) یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا۔ بلکہ مولانا انور شاہ صاحب (مرحوم) کے الفاظ میں ایسا دیدہ و دانستہ کیا گیا تاکہ دین میں کشاد پیدا ہو۔

بچوں کا صفحہ

ہم عید کیوں مناتے ہیں

راشد جمعتہ الوداع کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو اس نے اپنی امّی سے کہا کہ امّی جان! آج مولوی صاحب اپنے خطبہ میں بار بار پڑھتے تھے الوداع! اے ماہ رمضان الوداع! اور ساتھ روتے جاتے تھے۔ وہ روتے کیوں تھے؟ اس کی امّی نے کہا بیٹا! رمضان کا مہینہ بڑا خیر اور برکت کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس کے چلے جانے کا غم ہوتا ہے اسلئے لوگ روتے ہیں۔ راشد نے کہا کہ امی جان! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب رمضان شریف کا مہینہ وداع ہونے لگتا ہے تو لوگ روتے ہیں اور جب وہ وداع ہو جاتا ہے تو پھر عید مناتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟ راشد کی امّی نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا اور راشد سے کہا کہ شام کو تمہارے ابا آئیں گے تو یہ بات اُن سے پوچھنا۔

رات کے کھانے کے بعد راشد نے اپنے ابا سے وہی سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ بیٹا! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ عید کیا ہے اور اسے کیوں منایا جاتا ہے۔ جب تم یہ بات سمجھ لوگے تو تمہارے سوال کا جواب خود بخود سامنے آجائیگا۔ لو اب غور سے سنو!

تمہیں معلوم ہے کہ دُنیا کی ہر قوم نے سال میں کچھ دن ایسے مقرر کر رکھے ہیں جنہیں وہ قوم اپنے تیوہار کی حیثیت سے مناتی ہے۔ کرسمس عیسائیوں کا تیوہار ہے ابھی اگلے دنوں بسنت آئی تھی۔ وہ ہندوؤں کا تیوہار ہے۔ (مسلمان اُسے یوں ہی تفریحاً مناتے ہیں) مسلمانوں کے لئے ان کے خدا نے ایک دن تجویز کیا اور کہا کہ اس میں وہ خوشیاں منایا کریں۔

یہ سنکر راشد چونک اٹھا اور کہا کہ ابا جان! کیا ہمارے لئے خود خدا نے تیوہار مقرر کیا؟ جس تیوہار کو خدا نے مقرر کیا ہو وہ تو بہت بڑا تیوہار ہوا؟ "ہاں بیٹا! اس تیوہار کے بڑا ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے"؟ راشد کے ابا نے کہا۔ "تو ابا جان! مجھے بتایئے کہ اس تیوہار کی اہمیت کیا ہے"؟ راشد نے کہا۔ اس کے ابا نے کہا۔

"تم ذرا سوچو کہ اگر ایک شخص بچپن سے اندھا ہو گیا ہو۔ ہزار علاج معالجہ کے باوجود اس کی آنکھوں میں بینائی نہ آئی ہو۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا ہو۔ لیکن ایک دن اُسے ایسا سرمہ مل جائے جس سے اس کی بینائی واپس آ جائے۔ اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ وہ سب کچھ دیکھنے لگ جائے تو کیا یہ دن اس کی زندگی میں یاد رکھنے کے قابل نہیں ہو گا؟ کیا وہ ہمیشہ اس دن کی یاد نہیں منائے گا؟"

"ضرور منائے گا" راشد نے کہا۔

اس کے ابا نے کہا کہ اسلام سے پہلے دُنیا میں کہیں خدا کی وحی کی روشنی باقی نہیں رہی تھی ساری دنیا میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ انسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے۔ انہیں صحیح راستہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ایسے میں اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید

نازل کیا جس سے ساری دُنیا میں روشنی پھیل گئی۔ انسانوں کو صحیح راستہ کھلے طور پر نظر آنے لگ گیا۔ وہ اندھے تھے، انہیں آنکھیں مل گئیں۔ کہو بیٹا! یہ دن انسانوں کے لئے یادگار منانے کا تھا یا نہیں؟

"ضرور تھا ابا جان!"۔ راشد نے کہا۔

"یہی ہے وہ تیوہار جسے خدا نے تجویز کیا ہے"۔ راشد کے ابا نے کہا۔ "خدا نے کہا ہے کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ہے۔ یعنی اس میں قرآن نازل ہونے کی ابتدا ہوئی ہے اور اس کے بعد خدا نے کہا ہے کہ تمہیں چاہیئے کہ تم اس پر خوشیاں مناؤ۔ لہذا یہ تیوہار رمضان شریف کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ سارا مہینہ ہی خوشیاں منانے کا ہے۔ یہ جشنِ مسرت کا مہینہ ہے۔ اور اس کی جشن کی انتہا عید کہلاتی ہے"۔

"میں اب سمجھا کہ طلوع اسلام میں جب عید کے متعلق لکھا ہوتا ہے کہ یہ جشنِ نزولِ قرآن ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے"؟

راشد نے کہا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ "ابا جان! جب بات یہ ہے تو پھر مولوی صاحب جمعۃ الوداع کو روتے کیوں تھے"؟

"انہیں بیٹا معلوم نہیں کہ رمضان شریف کی اہمیت کس وجہ سے ہے اور عید کیوں منائی جاتی ہے۔ اچھا تم جاؤ اور اسکول کا کام کر کے سو جاؤ"!

راشد اپنے ابا کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ عید کی چھٹیوں کے بعد جب اسکول جائے گا تو وہاں لڑکوں کو بتائے گا کہ عید کیوں منائی جاتی ہے؟